لکھنؤ

تعمیر حیات

پندرہ روزہ

Regd No. LW/NP 56

Phone 22348 / 29747

TAMEER-E-HAYAT

Fortnightly

NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)

دُنیا کے ہر انسان کو فخر کرنا چاہیے

کہ ہماری نوع انسان میں ایک ایسا انسان پیدا ہوا جس سے انسانیت کا سر اونچا اور نام روشن ہوا، اگر آپ نہ آتے تو دُنیا کا نقشہ کیا ہوتا اور ہم انسانیت کی شرافت و عظمت کے لیے کس کو پیش کرتے؟ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہر انسان کے ہیں، محمد رسول اللہ سے اس دُنیا کی رونق اور نوعِ انسانی کی عظمت ہے، وہ کسی قوم کی ملک نہیں، ان پر کسی ملک کا اجارہ نہیں، وہ پوری انسانیت کا سرمایۂ فخر ہیں، کیوں آج کسی ملک کا انسان فخر و مسرت کے ساتھ یہ نہیں کہتا کہ میرا اس نوع سے تعلق ہے جس میں محمد رسول اللہ جیسا انسان کامل پیدا ہوا۔

آج انسانوں کا کون سا طبقہ ہے جس پر آپ کا براہِ راست یا بالواسطہ احسان نہیں ہے؟

کیا مردوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کو مردانگی اور آدمیت کی تعلیم دی۔

کیا عورتوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کے حقوق بتلائے اور ان کے لئے ہدایتیں اور وصیتیں فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ "جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔"

کیا کمزوروں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کی حمایت کی اور فرمایا کہ "مظلوم کی بددعا سے ڈرو کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں خدا کہتا ہے کہ میں شکستہ دلوں کے پاس ہوں۔"

کیا طاقتوروں اور حکمرانوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے اُن کے حقوق و فرائض بھی بتلائے، اور حدود بھی بتلائے اور انصاف کرنے والوں اور خدا سے ڈرنے والوں کو بشارت سُنائی کہ بادشاہ منصف رحمت کے سایہ میں ہوگا۔

کیا تاجروں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے تجارت کی فضیلت اور اس پیشہ کی شرافت بتلائی اور خود تجارت کرکے اس گروہ کی عزت بڑھائی، کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اور راست گفتار اور دیانت دار تاجر جنت میں قریب ہوں گے۔

کیا آپ کا مزدوروں پر احسان نہیں کہ آپ نے تاکید فرمائی کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دیدو۔

کیا جانوروں تک پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ہر وہ مخلوق جو جگر رکھتی ہے اور جس میں احساس و زندگی ہے اس کو آرام پہنچانا اور کھلانا پلانا بھی صدقہ ہے۔ "فی کل ذات کبد حرّی صدقۃ"۔

کیا ساری انسانی برادری پر آپ کا احسان نہیں کہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر آپ شہادت دیتے تھے کہ خدایا تیرے سب بندے بھائی بھائی ہیں "ان العباد کلھم اخوۃ"

کیا ساری دنیا پر آپ کا احسان نہیں کہ سب سے پہلے دنیا نے آپ ہی کی زبان سے سُنا کہ خدا کسی ملک قوم، نسل و برادری کا نہیں سارے جہانوں اور دُنیا کے سب انسانوں کا ہے جس دنیا میں آریوں کا خدا، یہودیوں کا خدا، مجوسیوں کا خدا، مصریوں کا خدا، ایرانیوں کا خدا کہا جاتا تھا وہاں "الحمد للہ رب العٰلمین" کی حقیقت کا اعلان ہوا اور اس کو نماز کا جز بنا دیا گیا۔

ہماری آپ کی دُنیا میں حکماء و فلاسفہ بھی آئے، ادباء و شعراء بھی، فاتح و کشور کشا بھی، سیاسی قائد اور قومی رہنما بھی، موجدین و محققین (سائنٹسٹ) بھی مگر کس کے آنے سے دنیا میں وہ بہار جو پیغمبروں کے آنے سے، پھر سب سے آخر سب سے بڑے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے آئی، کون اپنے ساتھ وہ شادابی، وہ برکتیں، وہ رحمتیں نوعِ انسانی کے لئے وہ دولتیں اور انسانیت کے لیے وہ نعمتیں لے کر آیا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، تیرہ سو برس کی انسانی تاریخ پورے وثوق کے ساتھ آپ کو خطاب کرکے کہتی ہے ؎

سرسبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو
ٹھیرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

مجمع بحار الانوار

(احادیث کی مشکلات حل کرنے کے لئے بے نظیر کتاب)

تالیف:۔ ملک المحدثین علامہ شیخ محمد طاہر پٹنی گجراتی (المتوفی ۹۸۶ھ)

اس کتاب کے بارے میں تمام دنیا کے علماء اور ماہرینِ فنِ حدیث کا اتفاق ہے کہ یہ اپنے موضوع پر منفرد اور بے نظیر ہے، جو اپنی جامعیت اور فنی رعایتوں کے اعتبار سے اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں سے فائق ہے۔ الفاظ حدیث بالخصوص صحاح ستہ کی لغوی مشکلات اور دیگر مباحث کے لئے یہ کتاب گویا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ جس میں لغوی تحقیق اور فنی بحثیں ایسی مبسوط اور جامع طریقہ پر کی گئی ہیں جو طالب علم کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہیں اور اس کے مرجع کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے۔

ہندوستان ہی نہیں بلادِ عربیہ کے علماء نے بھی اس کی عظمت اور اہمیت کا غیر معمولی اعتراف کیا ہے۔

یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی، قدر دانوں کی طلب بلکہ ان کے اصرار پر، اب خدا کا شکر ہے کہ نہایت آب و تاب اور عربی ٹائپ کی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ اچھے کاغذ پر، پہلی بار۔ محدث شہیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ کے گرانقدر مقدمہ اور محقق لغات مولانا عبدالحفیظ بلیاوی کی تصحیح و تنقیح کے بعد۔ ۵ جلدوں میں، دائرۃ المعارف حیدرآباد نے طبع کرکے اہل علم کی دیرینہ آرزو پوری کر دی ہے۔

کتاب کے مجموعی صفحات سے سوا تین ہزار سے زیادہ ہونے کے باوجود۔ نفع عام اور علم دین کی خدمت کے جذبہ سے۔ پورا سیٹ لینے والوں کے لئے اس کا ہدیہ صرف ڈیڑھ سو (۱۵۰) روپئے رکھا گیا ہے۔

ہندوستان میں

مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ

سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

جعلی لیبل، نقلی کیپسول اور ٹین کے ڈھکن سے ہوشیار!

نورانی تیل

درد۔ زخم۔ چوٹ۔ جلنے۔ کٹنے کی دوا۔

اب سُنہرے اور ہرے دو رنگے کیپسول پر ٹریڈ مارک دیکھ کر خریدیے۔

انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن یوپی

ہند تیل

ہر قسم کے جسمانی درد۔ چوٹ۔ زخم۔ موچ۔ جلنے۔ کٹنے وغیرہ جیسے گھریلو حادثوں کا فوری علاج ہے۔ اس کی مسلسل مالش کرنا بچوں کو تندرست و توانا بناتی ہے۔

تیار کردہ:۔ ہند سی۔ بی ورکس۔ مئوناتھ بھنجن یوپی

"تعمیر حیات" میں

اشتہار

دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

شربت نزلہ

معمولی کھانسی، زکام اور نزلہ کے لیے

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عطر مجموعہ نمبر ۳۹۱۸

پتہ حافظ محمد زکریا برادران تاجران عطر و تیل

بہترین چائے کا قابل اعتماد مرکز

عباس علاء الدین اینڈ کمپنی

نمبر ۱۴ حاجی بلڈنگ ایس وی ڈی روڈ

نل بازار بمبئی نمبر ۳

اسپشل مکسچر	کپ برانڈ
اسپشل ممری	گولڈن ٹاپ
ہوٹل مکسچر	فلاوری اڈنی

TELEGRAM:- CUP. KATTLY

PHONE 332220

لکھنؤ

تعمیرِ حیات

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۱۴ | ۲۵ر جون ۱۹۷۷ء ——— ۲۲ر رجب ۱۳۹۷ھ | شمارہ نمبر ۱۹

زرِ اشتراک اندرونِ ہند مع محصول ڈاک:
سالانہ: ۱۲ روپے ششماہی: سات روپے
فی پرچہ: ۶۰ پیسے
بیرونِ ہند مع محصول ڈاک:
بحری ڈاک سے: ایک پاؤنڈ ۔ شلنگ
ہوائی ڈاک سے، امریکہ و کناڈا اور
یورپین ممالک: ۳ پونڈ
افریقہ، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کے ممالک: ۲½ پونڈ
پاکستان: ۳۰ روپے
بنگلہ دیش: ۱۵ روپے

مکتوبِ امریکہ

زیرِ نظر شمارہ مکمل ہو چکا تھا اور طباعت کے لئے دہلی بھیجنے میں چند گھنٹے باقی تھے کہ امریکہ سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے رفیقِ سفر مولانا محمد رابع صاحب ندوی کا مکتوب گرامی بنام مولانا واضح رشید ندوی و مولانا محمد الحسنی موصول ہوا، ادارے کی کتابت روک کر اس معلومات افزا مکتوب کو ادارتی صفحہ پر افادۂ عام کی غرض سے شائع کیا جا رہا ہے۔

AHMAD M. SIDDIQI, M. D.
NADWA
98 CONKLIN AVE.
WOODMERE, L. I., N. Y. 11598 U.S.A
TELEPHONE (516) R69-1852

عزیزی واضح سلمہ، و عزیزی محمد میاں سلمہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

امید ہے کہ باخبر ہو گے، ہم لوگوں کے بخیریت نیویارک پہونچنے کا تار امید ہے کہ وہاں موصول ہو گیا ہوگا، دہلی سے سفر تو حسبِ پروگرام جمعرات کی صبح بوقتِ سحر شروع ہوا اور اندازہ یہ تھا کہ ۲ بجکر ۵ منٹ رات میں جہاز چل کر ۳ بجکر سہ پہر اسی روز نیویارک پہونچ جائے گا، رسمی طور پر تو یہ ۱۳ گھنٹے ہوئے لیکن اس میں ۹½ گھنٹے ملا کر وقت کا صحیح حساب بنتا ہے کیونکہ ہندوستان کے مقابلہ امریکہ کے مشرقی حصہ میں سورج ۹½ گھنٹے بعد نکلتا ہے، لیکن ہوا یہ کہ جہاز اپنی مشینی یا انتظامی کسی دشواری کی بنا پر ۶ گھنٹے دہلی ایرپورٹ پر لیٹ ہوا اور مع مسافروں کے دن ڈھلے تک رکا رہا، اور پھر چلا تو اس نے بمبئی کو مزید اسٹیشن بنانے کا اعلان کیا بمبئی میں مزید دو گھنٹے ٹھیرا چنانچہ ہم لوگ ہندوستان سے تقریباً ۱۱½ گھنٹے لیٹ نکلے جس کے نتیجہ میں نیویارک رات کے ۱۲½ بجے پہونچے اور قیام گاہ تک پہونچنے میں ۱½-۲ بج گیا، جس کو ہندوستانی وقت کے اعتبار سے دوسرے دن کے ۱۱-۱۲ بجے سمجھنا چاہئے، اس طرح ہر سفر پر کوئی ۳۲ گھنٹے صرف ہوئے، اس قدر طویل اور مسلسل سفر پہلی بار ہوائی جہاز سے کیا اسکے نتیجہ میں کئی روز تک نظامِ صحت متاثر رہا، لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ سلامتی اور صحت کے ساتھ نیویارک پہونچے، نیویارک میں کئی جاننے والے ہیں لیکن اکثر کو معلوم نہ تھا، البتہ سید ہدایت حسین صاحب کے صاحبزادہ سید ساجد حسین صاحب واقف تھے اور منتظر تھے، جہاز کے لیٹ ہو جانے کے باعث خود تو ہوائی اڈہ نہ پہونچ سکے لیکن اپنے ایک دوست کو مقرر کیا جنھوں نے پوری سہولت سے پہونچانے کی کوشش کی اور صبح انڈیانا پولس کے لئے ہوائی جہاز تک پہونچایا انڈیانا پولس نیویارک سے بجانب غرب تقریباً ۸۰۰ سو میل کے فاصلہ پر اور ایم۔ ایس۔ اے کا ہیڈ کوارٹر ہے نیز اس کے متعلقہ شہر بلومنگٹن میں اس کی کانفرنس ہو رہی ہے، ہم لوگ جمعہ سے خاصا پہلے بلومنگٹن پہونچ گئے۔ نیویارک سے انڈیانا پولس تک ہوائی جہاز سے اور وہاں سے ۵۰ میل دور بلومنگٹن کار سے پہونچنا ہوا، انڈیانا پولس ریاست انڈیانا کا صدر مقام ہے اور اس کی یونیورسٹی بلومنگٹن میں ہے بلومنگٹن کی شہری اہمیت صرف یونیورسٹی کی وجہ سے ہے، یہ انڈیانا یونیورسٹی کہی جاتی ہے اس میں عرب طلبا ۴۰۰ سو کے لگ بھگ ہیں، اور غیر عرب مسلمان سو کے لگ بھگ، لہذا اس یونیورسٹی میں مسلم طلبا کا اوسط دیگر یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں خاصا زیادہ ہے غالباً اسی لئے اس یونیورسٹی کی عمارتوں میں کانفرنس رکھی گئی، یونیورسٹی کے میس میں مدعوئین کا کھانا پکتا اسکے ہالوں میں کانفرنس اور نماز باجماعت ہوتی اس کے ہوسٹل اور بعض عمارتوں میں مندوبین کی اقامت گاہ بنی، مدعوئین کی تعداد ۲ ہزار کے لگ بھگ تھی جن میں زیادہ تر طلبا اور باقی دیگر اہل علم تھے، یہ سب کے سب عام طور پر مشرقی قوموں کے فرد اور مسلمان ہیں، جو امریکہ اور کناڈا کے اطراف

و اکناف سے جمع ہوئے اور ان کے افادہ کے لئے عالمِ اسلام کی متعدد ذی علم اور مشہور شخصیتوں کو بھی مدعو کیا گیا چنانچہ ان مدعوئین میں استاد یوسف القرضاوی، شیخ عبداللہ زرکی، شیخ محمد المبوری، شیخ عبداللہ منیعی استاد محمد المبارک، ماموں مجی مدظلہ، پروفیسر خورشید احمد اور متعدد اہم اشخاص تھے۔ یہاں یہ بات لائقِ تحسین پائی کہ ایک غیر مسلم یونیورسٹی نے مسلمانوں کے لئے یہ رواداری دکھائی کہ انکے اجتماع کو اپنی عمارتوں میں اس طرح جگہ دی جیسے کہ کوئی مسلم یونیورسٹی دیتی ہے، معلوم ہوا کہ یہ یہاں کا ایک معمول سا ہے باسانی یونیورسٹی کے عمارتوں کو ایسے کاموں کے لئے استعمال کے لئے دے دیتے ہیں۔

بلومنگٹن میں عرب، ہندستانی، پاکستانی اور ایشیائی و افریقی مسلمانوں کا دو ہزار کا مجمع ایسی فضا پیدا کر رہا تھا کہ گویا یہ شہر عالمِ اسلام ہی کا کوئی شہر ہے، دولت اور وسائلِ زندگی کی ترقی کے امریکی مظاہر ایک حد تک اب تیل پیدا کرنے والے عرب ملکوں کے بڑے شہروں میں بھی بننے لگے ہیں۔ اور اس میں جب اس بات کو شامل کر لیا جائے کہ صبح سے شام تک جن لوگوں سے زیادہ تر ہم لوگوں کو ملنا پڑا وہ مشرقی یا عرب تھے، تو ان مشرقی شہروں والے سے مزید مماثلت نظر آنے لگتا کوئی تعجب کی بات نہیں، یوں ظاہر ہے کہ امریکی تمدن و وسائلِ زندگی کی کثرت اور معیار کی بلندی میں بہت آگے جا چکا ہے حتیٰ کہ اب یورپ بھی اس سے پیچھے ہے یہ زندگی کے مظاہر اور وسائل کو ترقی دیکر اپنی دنیا کو مصنوعی جنت بنانے کی ایک کوشش ہے، صنعتی پیداوار اور مادی طاقت سے زندگی کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور انسان کو جسمانی محنت سے بڑی حد تک مستغنی بنا دیا گیا ہے، اکثر کام بٹن دبا کر انجام دے لئے جاتے ہیں بس پیسے ہونے چاہئیں، ٹیلی فون کو عام اور ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔

امریکی زندگی پر یہود کا غلبہ سب سے زیادہ ہے، ملک کی ۸۰ فیصد دولت پر یہود کا قبضہ ہے اس کی مدد سے ملک کی سیاست اور اس کے قائدین کو انہوں نے اپنی مرضی کا تابع بنا کر رکھا ہے عوام اگرچہ ان کو زیادہ پسند نہیں کرتے لیکن ملک کے کلیدی اختیارات پر ان کا کنٹرول ہے لہذا ان کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا، اطباء اور اہلِ قانون میں بھی ان کا اوسط بہت غیر معمولی ہے، ایک صاحب بتانے لگے کہ کسی طبیب یا وکیل کے مذہب کے بارے میں اگر معلوم نہ ہو تو احتیاطاً یہودی ہی سمجھنا چاہئے، صحافت تو ان کی مٹھی میں ہے، کوئی قانون انکے مفادات کے خلاف نہیں بن سکتا، کوئی سیاست ان کی مرضی کے برعکس نہیں چل سکتی، یہود کا اصل اوسط نیویارک ہیں، اس کے بعد مشرقی اور وسطی امریکہ میں ہے جنوبی صوبوں میں کم ہیں، فحاشی اور اخلاقی بے راہ روی کے فروغ میں ان کا خصوصی ہاتھ رہتا ہے۔

کالے مسلمانوں کے متعلق ہندوستان میں سنا تھا کہ بالکل گمراہ ہیں، لیکن یہاں آ کر پتہ چلا کہ اب راہِ راست کی طرف رخ شروع ہو گیا ہے کہ ان کی تحریک کے بانی علی جاہ محمد کے مرنے کے بعد ان کا بیٹا وارث علی قائم مقام ہوا اس کا رجحان مسلمانوں کی طرف میلان اور یکجہتی کا ہے ان میں کچھ لوگ اپنے کو بلالی کہتے ہیں، ان کا اصل اوسط اور مرکز شکاگو میں ہے، یہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے وسطی علاقہ میں واقع ہے، یوں یہ لوگ امریکہ کے بہت سے شہروں اور علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ نیویارک میں ایک تعداد میں ہیں، کالے امریکیوں کی ایک تعداد قتل و تشدد کے واقعات کا سبب بھی ہے جس سے تشدد امریکی زندگی میں خاصا پیدا ہو گیا ہے، نیویارک کے بعض محلوں میں لوگ اپنے کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں، یہاں دیہاتی آبادیاں بھی ہمارے یہاں کی سول لائن معلوم ہوتی ہیں، متوسط آمدنی والا بھی بہت مرتب اور معیاری زندگی گذارتا ہے اور اس کی آمدنی اس کے لئے معاون بنتی ہے، ہمارا اندازہ ہے کہ ہندوستان میں ایک آدمی جس اوسط سے روپے پاتا ہے یہاں کا آدمی اسی اوسط سے سوا یا ڈیڑھ ڈالر پاتا ہے، اور خرچ کے لحاظ سے جہاں ہندوستان کا ایک روپیہ صرف میں آتا ہے یہاں اسی کام کے لئے نصف ڈالر سے کام چل جاتا ہے حالانکہ تبادلہ کے لحاظ سے دونوں سکوں میں تقریباً ایک اور آٹھ کا فرق ہے، اللہ تعالیٰ نے اس ملک کو بہت ہی فراوانی کے ساتھ وسائلِ معیشت اور دولت عطا فرمائے ہیں، ملک بہت پھیلا ہوا اور بڑا ہے ہندوستان سے رقبہ میں تین گنا اور آبادی میں آدھا ہوگا، معدنیات اور زرعی پیداوار سے مالا مال ہے، یہاں کی قوم نے اپنی دولت سے فائدہ بھی پورا اٹھایا ہے۔ پیداوار اور تکنالوجی میں اس وقت (باقی آئندہ)

نبیِ اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانی فلاح و بقا

انتخاب: مولانا افتخار فریدی مراد آباد

ایک سائل دنیا و آخرت کی فلاح و بقا و کامیابی کی راہ پانے کے چند سوال کرتا ہے:

سائل: اے اللہ کے رسول! میں چاہتا ہوں کہ دنیا کا سب سے بڑا عالم بن جاؤں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تو خدا سے ڈرتا رہ تو سب سے بڑا عالم بن جائے گا۔

سائل: میں چاہتا ہوں کہ تمام انسانوں سے زیادہ مالدار بن جاؤں۔

حضورؐ نے فرمایا: تو قناعت اختیار کر سب سے زیادہ مالدار ہو جائے گا۔

سائل: میں چاہتا ہوں کہ سب سے بہتر شخص ہو جاؤں۔

حضورؐ نے فرمایا: سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہونچائے، سب کے لئے نفع بخش بن جا بہتر ہو جائے گا۔

سائل: سب سے زیادہ عادل بننا چاہتا ہوں۔

حضورؐ نے فرمایا: تمام انسانوں کے لئے وہی پسند کر جو اپنے لئے پسند کرتا ہے سب سے زیادہ منصف عادل بن جائے گا۔

سائل: سب لوگوں سے زیادہ خدا کے دربار میں مخصوص و مقرب بننا چاہتا ہوں۔

حضورؐ نے فرمایا: خدا کا ذکر خوب زیادہ کر خدا کے دربار میں مخصوص مقرب ہو جائے گا۔

سائل: میں محسنوں اور نیکوکاروں میں سے ہونا چاہتا ہوں۔

حضورؐ نے فرمایا: اللہ کی عبادت ایسی کر کہ تو دیکھ رہا ہے اگر یہ نہ ہو سکے تو جیسے وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

سائل: میں چاہتا ہوں میرا ایمان مکمل ہو جائے۔

حضورؐ نے فرمایا: اخلاق سنوار لے تیرا ایمان مکمل ہو جائے گا۔

سائل نے عرض کیا: میں اطاعت گذاروں میں سے ہونا چاہتا ہوں۔

حضورؐ نے فرمایا: اپنے فرائض ادا کرتے رہو تیرا مطیع میں شمار ہو جائے گا۔

سائل: میں خدا سے اس حال میں ملنا چاہتا ہوں کہ تمام گناہوں سے پاک و صاف ہوں۔

حضورؐ نے فرمایا: تو جنابت سے غسل کیا کر اس کی برکت سے گناہوں سے پاک اٹھے گا۔

سائل: میں چاہتا ہوں حشر میں نور کے ساتھ اٹھایا جاؤں۔

حضورؐ نے فرمایا: تو کسی پر ظلم نہ کر قیامت کے دن نور میں اٹھے گا۔

سائل: میں چاہتا ہوں خدا مجھ پر رحم کرے۔

حضورؐ نے فرمایا: تو اپنی جان پر اور خلقِ خدا پر رحم کر، خدا تجھ پر رحم کرے گا۔

سائل: میں چاہتا ہوں میرے گناہ کم ہوں۔

حضورؐ نے فرمایا: استغفار کثرت سے پڑھا کر تیرے گناہ کمتر ہو جائیں گے۔

سائل: میرے رزق میں زیادتی ہو۔

حضورؐ: ہمیشہ طہارت کے ساتھ رہ تیرے رزق میں برکت ہوگی۔

سائل: میں چاہتا ہوں خدا و رسول کا دوست بن جاؤں۔

حضورؐ: جو خدا و رسول کو پسند ہے وہ پسند کر جو خدا و رسول کو ناپسند ہے تو اسے ناپسند کر خدا و رسول کا دوست بن جائے گا۔

سائل: میں خدا کے غضب سے بچنا چاہتا ہوں۔

حضورؐ: تو کسی پر بے جا غصہ نہ کر تو خدا کے غضب و ناراضی سے بچے گا۔

سائل: میں خدا کے دربار میں مستجاب الدعوات بننا چاہتا ہوں۔

حضورؐ: تو خدا کی حرام چیزوں اور باتوں سے بچ تو مستجاب الدعوات بن جائے گا۔

القرآن

★ ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ "اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجا لاؤ اور اس آخر گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے"۔ (الحجر ۹۷ تا ۹۹)

★ پس اے محمدؐ، تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں ٹھیک ٹھیک راہِ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔ ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تمہیں مدد نہ پہنچے گی۔ (ہود: ۱۱۱ تا ۱۱۳)

★ ہم نے زمین اور آسمان کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر پیدا نہیں کیا ہے اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے۔ پس اے محمدؐ تم (ان بیہودگیوں پر) شریفانہ درگزر سے کام لو۔ یقیناً تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ (الحجر: ۸۵ تا ۸۶)

★ اور اے نبیؐ، تم اس ہدایت کی پیروی کئے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے، اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ (یونس: ۱۰۹)

★ اے محمدؐ: ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو، اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے، لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔ (بنی اسرائیل: ۷۳ تا ۷۵)

الحدیث

★ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:
"دعوتی کام کرنے والوں کو صابر اور بردبار ہونا چاہئے۔ لوگ اگر غصہ دلانے والی حرکات پر اتر آئیں تو ایسے موقع پر غصہ کا جواب غصے سے نہیں دینا چاہئے، غصہ آئے تو تھوک دینا چاہئے۔ اگر لوگ ایسا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا اور دشمن ان کے سامنے جھک جائے گا، وہ گہرا دوست اور پرجوش حامی بن جائے گا۔ (بخاری)

★ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ قیس کے پاس دین اور اس کے احکام سکھانے کے لئے بھیجا، وہاں پہنچکر مجھے تجربے سے معلوم ہوا گویا یہ بدکے ہوئے اونٹ ہیں۔ دنیا کے حریص، ان کا کوئی نصب العین نہیں ہے، ان کی ساری دلچسپی اپنی بکریوں اور اونٹوں سے ہے تو میں نبی صلی اللہ کے پاس واپس پہنچا، آپ نے پوچھا "اے عمارؓ! اپنے کام کی رپورٹ دو کیا کیا؟
تو میں نے آپؐ کو سارا قصہ سنایا۔ میں نے آپؐ کو بتایا کہ یہ لوگ دین سے غافل ہیں۔
آپ نے فرمایا، "اے عمارؓ! ان سے زیادہ تعجب خیز معاملہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے دین کا علم سیکھا مگر انہی کی طرح دین سے غافل اور بے پرواہ ہو گئے۔"

★ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، "تم میں سے جس شخص نے اپنے معاشرے میں کوئی برائی دیکھی اور طاقت استعمال کر کے اسے دور کر دیا تو وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوا اور جس شخص نے طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے اپنی زبان استعمال کی اور اس کے خلاف آواز اٹھائی وہ بھی سبکدوش ہوا اور جو شخص اپنی زبان نہ استعمال کر سکے اور دل میں اس برائی سے نفرت کرے اور برا سمجھے تو وہ بھی مواخذہ سے بچ جائے گا اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔
(ترغیب و ترہیب بحوالہ نسائی)

مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ

ایک ہمہ جہت اور جامع صفات شخصیت

عبد العلیم ندوی دریابادی

برسوں پہلے ایک بچے سے کسی نے پوچھا' بتاؤ اللہ میاں کیسے ہیں؟ طفلانہ جواب بغیر کسی توقف کے نکلا' جیسے مولانا صاحب! بچپن تو خیر اب کب کا گیا گزرا ہوا لیکن الوہیت اور عبدیت کے ذاتی وصفاتی فرق کے ساتھ وہ تصور اب تک ذہن میں ہے' مولانا مرحوم کی شفقت، مہربانی، غصہ، ناراضی، معافی، خیر خواہی، غرض وہ ساری خدائی صفتیں جو عباد اللہ کی پہچان ہیں، بچپن کے اس تصور کو برابر حقیقت میں بدلتی رہیں۔

لوگوں نے لکھا اور لکھیں گے کہ مولانا کی وفات سے ایک تہذیبی اور تمدنی عہد کا خاتمہ ہوگیا، اعلیٰ اخلاقی یا مشرقی قدروں کا ایک دلکش نمونہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، حالی، شبلی، اکبر، جوہر، اقبال اور سید سلیمان ندوی کی سی باکمال ہستیوں کا غم بیک وقت تازہ ہوگیا اور ایک ہر جہت اور جامع صفات شخصیت نہ رہی، واقعہ ہے کہ ایسی شخصیت جس کی تشکیل وتکمیل میں اتنے اہم عناصر کی کارفرمائی شامل ہو اب مشکل سے ہی دیکھنے کو ملے گی۔

اصل یہ ہے کہ مولانا نے جس زمانہ، گھرانہ اور ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ دور تھا ہی کچھ عجیب، ایک جمی جمائی تہذیب کا چل چلاؤ اور اس کی جگہ ایک دوسرے اور اجنبی طرز زندگی کی شروعات، دھوپ چھاؤں میں سے شروع ہوگئی،

مولانا کی آنکھوں نے جس روشنی میں دیکھنا اور پہچاننا سیکھا وہ یقیناً نئے دور کے سورج کی روشنی تھی لیکن جن روشندانوں سے یہ روشنی چھن چھن کر آرہی تھی وہ بہر حال قدیم تھے،

دادا مفتی مظہر کریم قدیم علوم کے امین تھے، والد صاحب حاجی عبد القادر گرچہ مولوی تھے لیکن اس زمانہ کے ڈپٹی کلکٹر بھی تھے، پس منظر سراسر مذہبی لیکن پیش نظر کچھ نئی تجلیاں بھی تھیں، تعلیمی آغاز روایتی طور پر مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی کتابوں اور مولوی سید محمد ذکی اور مولوی عظمت اللہ فرنگی محلی کے تلمذ سے ہوا لیکن زمانہ نے رخ، کیننگ کالج لکھنؤ سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی اور ڈاکٹر کیمرن کی طرف موڑ دیا، یہ تعلیمی سفر اس زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کی کہانی خود بیان کر رہا ہے، غدر کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ صورت حال عجیب تھی اذیت ناک رد اور ناخوشگوار قبول کی کشمکش یا کسمساہٹ تھی، پرانی پیڑھیاں اپنے قدیم ومضبوط اعتقاد کی بنا پر کہہ رہی تھیں کہ تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے لیکن نئی نسل کے لئے اس دوراہے پر صراط مستقیم کا انتخاب آسان نہ تھا، اس لئے ذرا بھی تعجب نہیں کہ جو بچہ، بچپن میں اسلام کا پرستار اور عیسائیوں کی تردید کا خواستگار تھا وہ جب عقل کی پختگی کی منزل میں پہونچا تو اسلام سے نہ صرف بیگانہ بلکہ بیزار بھی ہو چکا تھا، مولانا کا یہ دور جوانی ہر تشکیک والحاد کا دور تھا ان کی زندگی کا سب سے اہم دور ہے، اسی زمانہ میں وہ جدید مغربی لٹریچر سے متعارف ہوئے پھر متاثر ہوئے ذاتی اعتبار سے یہ تاثر شاید اتنا اہم نہ سمجھا جاتا لیکن ہوا یہ کہ وہ ان مادہ پرست نظریات کے مبلغ بھی بن گئے، اس دور کی تصنیفات، مبادی فلسفہ، فلسفہ اجتماع اور فلسفہ جذبات جنہیں بعد میں خود انہوں نے اپنی تصنیفات کی فہرست سے خارج کر دیا، اور دوسرے مضامین میں مغربی فلاسفہ کے خیالات کا عکس یا ترجمانی جگہ جگہ نظر آتی ہے، اس ملحدانہ وقفہ یا مذہب بیزاری کی مدت شاید دس سال رہی،

یہ دور ملحدانہ ضرور تھا لیکن اس میں جمود نہ تھا

عقلیت ان کی فطرت سلیم پر غالب نہ آتی تھی، عقل وفطرت کی کشمکش میں اگر فطرت جویائے حق ہے تو عقل کا غلبہ زیادہ مدت تک نہیں رہتا، اس طبع حق پسند کے ساتھ ان کی خوش نصیبی یہ تھی کہ اس زمانہ کے مصلحین کی توجہ بھی ان کو حاصل ہوگئی، اکبر، جوہر، مہدی افادی اور مولانا شبلی، ان عناصر اربعہ نے مولانا کی روح کو ایک اور ہی قالب عطا کیا، کیسی عجیب بات ہے ایک شاعر، ایک لیڈر، ایک رنگین انشاپرداز اور ایک وہ جسے زاہدوں نے کافر

اور کافروں نے مسلمان سمجھا۔

ان سب نے مل کر ایک ایسے ذہن کو اسلام کی سمت موڑا جو ممکن تھا کہ متوازی سمت میں اسلام کے لئے خطرناک ومضرت رساں ثابت ہوتا، ان چاروں میں تین تو قطعاً نہ عالم دین تھے نہ کسی خانقاہ کے گوشہ نشیں، لیکن اسلام کی حمایت وحمیت میں ایسے سرشار کہ ایک فرد کی گمراہی بھی ان سے دیکھی نہ گئی، سوچنے والا کبھی اس اتفاق پر شکر ادا کرتا ہے ورنہ یہ بھی تو ممکن تھا کہ دستار وعمامہ اور قبا وعبا، جوش اسلامی میں کفر کے فتوے اسقدر سر کرتے کہ سامنے والا لہولہان ہو جاتا، شاید وہ اسیر بھی ہو جاتا لیکن کون جانے وہ مطیع ہوتا بھی یا نہیں، مولانا کی بعد کی زندگی میں ہر قدم

پر ان کے اسلام لانے کے اسباب و اثرات نظر آتے ہیں، ان کے ناقدین یا معترضین ان کے بعض دینی خیالات پر سخت گرفت کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی گرفت حق بجانب ہے لیکن اگر وہ مولانا کی زندگی کے اس سب سے اہم دور کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو انہیں یقین ہو جائے کہ مولانا کا مسلک خواہ شیعوں سے متعلق ہو یا احمدیوں سے، اس میں بہر حال وہ سوز وکرب اور اس سے پیدا ہونے والی نرم دلی ہے جس سے کبھی خود مولانا کا سابقہ ہوا تھا، گم کردہ راہ سے ہمدردی ومحبت اس سے بڑھ کر اور کیسے ہو سکتی ہے جو خود کبھی گم کردہ راہ رہا ہو۔

جن لوگوں نے ان سے باتیں کی ہیں، ان کی تحریریں پڑھی ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ کافر کو کافر کہنے میں ان کے لہجہ میں سختی اور انداز بیان میں درشتی کیوں نہ ہوتی تھی، ان کی باتوں سے ہمیشہ اس کا اظہار ہوتا رہا کہ میں تو اس رسولؐ کی امت میں ہوں جس کا شعار گنہگاروں کی شفاعت اور خطاکاروں سے درگزر پر تھا پھر میں بے دھڑک کفر کا تمغہ اور جہنم کا پروانہ کس طرح عطا کروں۔

خیر مولانا جلد ہی فلسفۂ الحاد کی پیچ

گلیوں سے نکل کر اس کوچہ تک آگئے' جو ہمیشہ عاشقوں، دیوانوں اور اہل جنوں سے آباد رہا ہے، بے جان مادہ کے کیف اور پھیکے تجربے کے بعد اب جو نئی روحانی لذت ملی تو پھر مولانا نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا' اکبر وجوہر نے راہ دکھائی' شبلی نے راہبری کی اور مرشد تھانوی نے منزل مقصود تک پہونچا دیا، عشق کی شورش نے دیوانگی اور پھر جنوں کا رنگ اختیار کیا،

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی دیوانگی میں شائبہ ہمیشہ فرزانگی کا شامل رہا، انہیں منصور کی تنگ ظرفی والی تقلید منظور نہ تھی، مرشد بھی باہوش ملا جس نے دیوانہ کو فرزانہ بنا دیا۔

ممکن ہے کبھی کبھی پاسبان عقل کو تنہا بھی چھوڑ دیتے ہوں لیکن اس تنہائی اور خلوت کی لذت کو نہ انہوں نے مشتہر کرنا چاہا نہ اس کی شہرت ہی ہوئی، میری نگاہوں کے سامنے اب بھی وہ منظر ہے جب بھوپال میں وہ حضرت شاہ یعقوب صاحب مجددی کے سامنے سر جھکائے، خاموش، زانو تہہ کیے ہوئے تھے، جنوں جب با ادب ہوتا ہے تو منظر بھی کچھ اور ہوتا ہے، دھول دھپا نہ تو سراپا ناز کا شیوہ ہے نہ سرتا پا نیاز کا ــــ مولانا جا بجا تحریروں اور اکثر نشستوں میں یہ مصرعہ عجب انداز سے پڑھا کرتے تھے۔ ع

خیال ہی میں مزے وصل دلربا کے لئے

اب سوچتا ہوں بھوپال کی وہ نشست کہیں اسی مصرعہ کی عملی تشریح تو نہ تھی!

مولانا، جنوں کی اس منزل تک تو بعد میں آئے، اس سے پہلے راہ میں عشق نے اپنے لہو سے جو چادر نکل بچھائی، وہ ہے دیکھنے کی چیز، فلسفیانہ مضامین، مکالمات، رکھلے، ہم آپ، زود پشیماں توک کی غبار راہ بن کر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھیں اب تو تا حد نظر رنگ وبو کی رعنائیاں تھیں، فیہ ما فیہ تصوف اسلام، تمدن اسلام، اکبر نامہ، سفر حجاز، جغرافیہ قرآنی، اعلام القرآن، محمد علی ذاتی ڈائری، بشریت انبیاء، حکیم الامت، خطبات ماجدی اور پھر سب سے بڑھ کر خاتمہ بالخیر کی بشیر تفسیر ماجدی!! زندگی کا ہر لمحہ ناکامی کے کفارہ وتلافی میں ایسا لگایا کہ ساری زندگی قابل رشک بن گئی تھی لہ

خود نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

مولانا کی کتابوں میں خواہ انکے نام اور موضوع کتنے ہی متنوع کیوں نہ ہوں ایک چیز قدر مشترک کے طور پر ہر جگہ نظر آتی ہے اور وہ ہے اسلامی روح، وہ "سچ" اور "صدق" کے صفحات ہوں یا دوسری کتابوں کے بے شمار مقدمے، دیباچے، تقریظیں اور تبصرے، ان کے سوچنے سمجھنے حسن وقبح کو پرکھنے کا معیار یا اس معیار کا عنصر غالب صرف یہی چیز تھی، اپنوں سے ناراضی ہو یا غیروں کی مداحی وحوصلہ افزائی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ کسوٹی ان کی اسلامی روح تھی ــــ یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انہوں نے اسلامی روح کو آب ورنگ دیا تھا ادب سے'

وہ فطری لحاظ سے ادیب تھے،

فلسفہ کا خشک موضوع ہو یا تفسیر کا محتاط مبحث، قدیم علماء کے تصورات ہوں یا جدید دانشوروں کے نظریات، حجاز وارض پاک کے سفرنامے ہوں یا محبوب وممدوح شخصیتوں کے خاکے، ادب سے ان کا رشتہ کہیں نہیں ٹوٹتا اور ادب میں بھی طنز کی خاص صنف پر زیادہ توجہ رہی جس کے شاید وہ موجد بھی تھے اور خاتم بھی ــــ وہ اسلام کے خلاف یا انہی معنوں میں مشرقی تہذیب کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہ کرتے تھے' ان کا خمیر وضمیر تیار ہی ایسا کیا گیا تھا جن پاک روحوں نے اس خمیر کی تیاری میں حصہ لیا تھا خود ان کا وصف ذاتی یہی تھا کہ وہ مغرب کی فضاؤں میں پلنے بڑھنے کے باوجود زہر ہلاہل کو قند نہ کہہ سکے تھے اور نہ کہہ سکتے تھے خواہ منطق حیلہ گر اور عقل فسوں ساز اس پر کتنی ہی بضد کیوں نہ ہوتی کہ جو نظر آتا ہے وہ سراب نہیں چشمۂ حیات ہے۔

یگانہ چنگیزی ہوں یا جوش ملیح آبادی ہوں یا حیات اللہ اور عظیم بیگ ہوں یا منٹو، انہیں کسی سے ذاتی پرخاش نہ تھی لیکن جہاں حرف، اسلام کی عظمت اور اس کے اصولوں پر آئے وہاں وہ سارے رشتوں اور تعلقات کو بالائے طاق رکھ کر میدان میں آجاتے تھے،

اللہ کے لئے محبت اور اللہ ہی کیلئے نفرت، ایمان کامل کی علامت ہے اور شک نہیں کہ مولانا نے قدم قدم پر اپنے مومن کامل ہونے کے ثبوت فراہم کئے،

سوچتا ہوں کہ وہ جو جاتا گاندھی کے جذبہ توحید، رانا بھگوان داس کی نعت گوئی اور مالک رام کے صف مسلمان ہونے سے "عجب کیا ....." کی توقعات قائم کر لیا کرتے تھے وہ تنگ نظر متعصب اور آج کل کی اصطلاح میں دقیانوسی کیسے ہو سکتے تھے، اصل یہی ہے کہ محبت ونفرت کا معیار ہی کچھ اور تھا ؎

اسکی نفرت بھی عمیق اسکی محبت بھی عمیق

اپنوں کے احتساب میں یہ تقاضائے فطرت وہ زیادہ شدید تھے'

اس احتساب کا تعلق صرف افراد سے ہی نہیں، اجتماعی اداروں اور بعض خالص اسلامی اداروں جیسے ندوۃ العلماء اور دار المصنفین تک سے تھا ان اداروں کے ذمہ داروں سے ان کی وفات پر جہاں اظہار غم میں سب کچھ کہا وہیں یہ بات بھی کہی کہ ان کا سب سے بڑا محتسب جاتا رہا، اب بزرگانہ انداز میں ٹوکنے والا مخلصانہ گرفت کرنے والا اور ہمدردانہ مشورے دینے والا نہ رہا، ؎ کبھی یہ شعر کتنا سچا اور موثر تھا،

محتسب کی خیر ہو اونچا ہے اسکے نام سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانہ کا نام

اب یہ ظرف کی بات تھی کہ کسی نے اس احتساب کو سر آنکھوں پر لیا اور کوئی چراغ پا ہو گیا۔ ظرف کا ذکر آیا تو ایک واقعہ یاد آ گیا، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، صدر جمہوریہ منتخب ہونے کے اس سے قبل مولانا ان کی کئی باتوں پر گرفت کر چکے تھے، یار لوگ اسے بے بھی اڑتے تھے لیکن ذاکر صاحب اور مولانا جن بلندیوں پر تھے وہاں ایسی پست باتوں کا کیا گزر! خیر کہنے کی بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب نے صدر منتخب ہوتے ہی نیازمندانہ تعلق میں مولانا کو بذریعہ تار اس کی اطلاع دی، یہ وقت تھا کہ مصلحت شناس دنیا سب کچھ فراموش کر کے دیرینہ تعلقات اور آئندہ بہترین خواہشات کے خوابی خوابی ڈھیر لگا دیتی لیکن مولانا نے صرف "الحمد للہ" لکھ کر اپنے امتیازی ادبی وصف کا خوبصورت ترین استعمال کیا، لطف یہ کہ ذاکر صاحب نے "سبحان اللہ" کہہ کر وصول کرنے کا حق بھی ادا کر دیا۔ ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

جواہر لال نہرو، مولانا کی کئی باتوں سے جداگانہ الگ رہ سکتے تھے، اس کے باوجود

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۳ء میں جب کہ شاید پہلے عام انتخابات ہو رہے تھے وہ دریاباد سے ۸ - ۹ میل کے فاصلہ پر رام سنیہی گھاٹ، تقریر کے لئے آئے، وہاں پہونچ کر مولانا یاد آئے، بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ ایک شام جمہوریہ ہند کا وزیر اعظم، دریاباد کے سنسان مقام پر راستہ کی ناہمواریاں سہتا ہوا صرف دو تین آدمیوں کے ساتھ مولانا سے ملنے خاموشی سے آیا اور چلا گیا یہ واقعہ بھی دونوں کی وسعت ظرف کی شہادت دیتا ہے'

اُدھر وہ مشرق کی قابل فخر وضعداری اور ادھر وصفی خوش گلی وصدق گفتاری۔

مولانا علی میاں نے ایک بار فرمایا کہ مولانا مرحوم جامع صفات تو تھے ہی، جامع اضداد بھی تھے، ان کی بات سن کر تصور میں ایک ایسا ترشا ہوا ہیرا ابھرا جس کا ہر رخ اور ہر رنگ مختلف بھی ہو اور محبوب بھی!

انیسویں صدی نے چلتے چلتے بیسویں صدی کو ورثہ میں جو لعل وجواہر سونپے تھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان میں سب سے نایاب اور قیمتی ہیرا تھے، ان کی یہ جامع صفاتی دراصل ان کی اپنی اس ٹھوس شخصیت اور ذاتی ریاضت کا پرتو تھی جسے مکمل انسانیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے،

ان کے پاس بیٹھنے والے کچھ ایسے بھی تھے جنہیں ان کے علمی وادبی مقام سے بحث نہیں انہیں ان کی اصح انسانیت سے عشق تھا،

وہ جو بڑوں میں بڑے اور بچوں میں انہیں کے سے ہو جاتے تھے، جنہیں اپنے حاضرین ذاتی کا خیال اسی قدر تھا جتنا قومی وملکی معاملات کا، ان کے پاس بیٹھنے والوں میں کبھی کبھی تو تین تین نسلوں کا اجتماع ہو جاتا لیکن پھر بھی بڑے سے بڑا صاحب علم اور معمولی کم سواد ان کی مجلس سے یکساں لطف وکیف اٹھا سکتا تھا اور اٹھاتا تھا، بڑی باغ وبہار مجلس، یہ مجلس علوم ومعارف کا خزانہ تھا، کیا کیا شبلی وتھانوی کا ذکر اکثر رہتا، اکبر کے اشعار اور جوہر کی گفتار کی بھی تکرار رہتی جو ہر ...

کا ذکر، وہ بھی ایسے عاشق کی زبان سے!! آہ، تاثیر و تاثر کا وہ سماں اب کہاں! پھر اس مجلس گفتگو میں ضلع جگت، تلازموں اور محاوروں کے ایسے برجستہ و بیساختہ استعمال، جو سننے والوں کو نہ صرف ذوق کی پاکیزگی بلکہ ایک عجب روحانی نشاط سے ہمکنار کرتے، کیسی کیسی باتیں یاد آرہی ہیں، لکھنؤ سے ایک صاحب نے پنیر بھیجا جسے انگریزی میں "چیز" کہتے ہیں، ایک جملہ میں کس مزہ سے اس کا استعمال کیا "ناچیز کو کیا چیز آپ نے بھیجی"۔ کلکتہ کے مشہور عالم و حکیم جناب محمد زماں صاحب قاسمی نے اپنے دواخانہ کا تیل اور سُرمہ بھیجا، اسی وقت ایک سطر لکھ کر کس غضب کا شکریہ ادا کیا "جناب کا تیل اور سُرمہ ملا، میرے آنکھوں پر"۔ دریاباد میں ایک کنواں دریافت ہوا، خبر اڑی کہ اس کا پانی ہر مرض کی دوا ہے، پھر کیا تھا حکیم شمس الدین مرحوم کو یہ خوبصورت جملہ لکھ بھیجا "آجکل دریاباد کی خلقت کنوئیں کی چاہ میں باؤلی ہو رہی ہے"۔ والد صاحب قبلہ کے ہاتھوں میں کتاب دیکھی، کہہ اٹھے "صدیق میاں، اہل کتاب تو ہو گئے، صاحب کتاب کب ہوگے"، اپنے دیرینہ رفیق و ہمدم جناب مولوی تقی علیخاں صاحب کے چاروں صاحبزادے ندوہ کے فاضل، بس کنیت تجویز ہوگئی "ابوالندوہ"۔ بھوپال میں ایک صاحب محمد اسرائیل نامی سے ملنے گئے، انہوں نے اپنے بیٹوں کا تعارف کرایا، ساتھ میں شاید مولانا عمران خاں صاحب کے صاحبزادہ بھی تھے فوراً یہ فقرہ زبان پر آگیا "بھئی یہ آل عمران کے ساتھ بنی اسرائیل کی ملاقات خوب رہی"

ہمنشینوں میں بھی ان کا یہ جملہ اثر کر گیا تھا،

دریاباد میں ایک صاحب نے کپڑے کی دوکان کھولی، دوکان کا نام مولانا سے تجویز کرانا چاہا مولانا نے حاضرین مجلس پر یہ کام چھوڑا، خوب خوب نام تجویز ہوئے لیکن انوار بھائی زیادہ مزاج شناس نکلے، نام تجویز کیا "آپ کی دوکان" اور مولانا پھڑک گئے "خوب خوب" کہہ کر دیر تک لطف لیتے رہے، عتیق، میرے برادر محترم کا نام ہے ایک دن ان سے کہنے لگے "میاں اب تمہارے گھر کا نام "بیت العتیق" ہونا چاہیئے"۔ ہائے کیسی کیسی یادیں ہیں، ان کی ہر نشست میں بیٹھنے والے کی تمنا یہی ہوتی تھی کہ الٰہی یہ صحبت دراز تر ہوتی رہے، پُرلطف باتوں کے ساتھ مولانا کا مخصوص شاہانہ انداز بیان اور ایک دلنواز دلآویز تبسم، مولانا کے سُرخ و سفید چہرہ اور نورانی ریشم سی ملائم اور باسلیقہ داڑھی پر یہ تبسم عجب بہار دکھلاتا تھا،

بس ایسا نظر آتا کہ تختۂ گل ہے اور گل مہر اور املتاس کے سرخ و زرد پھولوں سے چاندنی چھن رہی ہے،

سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کی نگاہ جب روئے انورؐ کے دیدار سے شرفیاب ہوئی تو وہ بے اختیار کہہ اٹھے "لیس ھٰذا بوجہ کذاب" (یہ چہرہ کسی دروغ گو کا نہیں) مولانا اسی ماہ رخ شمع رسالت کے ایک پروانہ تھے، پھر کیا عجب کہ دیکھنے والے ان کو دیکھ کر کہہ دیتے کہ ہاں یہ چہرہ بھی "سچ" اور "صدق" کے خادم ایک سچے کا چہرہ ہے۔

زندہ دلی، شگفتہ مزاجی، سبک روحی اور خوش طبعی ان کی طبیعت کا خاصہ تھیں لیکن یہ باتیں صرف اس وقت کی یادگار ہیں جب وہ زندگی کے سفر میں تنہا نہ تھے، شریک حیات ہر گام پر ساتھ تھیں، ان سے بچھڑنے کے بعد سبک روحی و خوش طبعی کے جوہر ممکن ہے کچھ باقی رہے ہوں لیکن زندہ دلی اور شگفتگی تو جنت مکانی اماں بی کے ساتھ ہی بھولی بسری باتیں ہو چکی تھیں، پھر تو نشستوں نے سماں کچھ اور دیکھا، دنیا سے بے تعلقی، آخرت کا ہمہ وقت ذکر یا پھر خاموشی اور ایک مستقل نمی جو پلکوں سے لے کر روح تک میں سرایت کئے ہوئے تھی، معمولات اب بھی ہمیشہ کی طرح وقت کی پابندی، ترتیب و سلیقہ کے ساتھ جاری تھے تصنیف و تالیف، سفر اور ملاقاتیں سب پہلے کی طرح لیکن اب نہ وہ جوش تھا نہ وہ سرمستی۔

دل تو ان کا کب کا ٹوٹ چکا تھا، حیدرآباد کی بربادی، بھوپال کا زوال پھر آخر میں ڈھاکہ کا سقوط یہ تو بربادیوں کے عنوان تھے ورنہ ان کے ضمن میں تہذیب، زبان، تعلیمی اداروں اور عزت و ناموس پر جو تباہیاں آئیں ان کا کیا شمار،

پھر مزید، مسلمانوں کی بے حسی، انہیں اس قوم سے خیر و بہبود کی توقع بالکل نہ رہی تھی، اتنی جذباتی قوم جو مسجد کے ایک حصہ کے شہید ہونے پر ہزاروں جانیں قربان کر دیتی لیکن انہی مسجدوں کی تعمیر کے لئے ایک پیسہ نہ نکال سکتی، جو علی گڑھ کے لئے یوم سیاہ منا کر ایک ایک دن میں لاکھوں کا نقصان برداشت کر سکتی تھی لیکن اپنی ہی آواز کی شنوائی کے لئے ایک انگریزی اخبار کے لئے سرمایہ فراہم نہ کر سکتی، اس سے وہ کوئی توقع کرتے بھی تو کیسے؟

انہوں نے تقریباً ایک صدی کی تحریکوں، طوفانوں اور پھر بے حسی کے مظاہر کا مشاہدہ کیا تھا اس لئے اس سلسلہ میں ان کی رائے سے اختلاف کے باوجود ان کے احساس کے وزن سے انکار نہیں کیا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طبقہ اور گروپ خصوصاً سیاسی تحریکوں سے الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے اور اسی کے ساتھ ملت کے باشعور باصلاحیت ذہنوں کو ان ہنگاموں سے دور دیکھنا پسند کرتے تھے، مختلف مسلم جماعتوں سے ان کے اختلاف کو اس پس منظر میں دیکھا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں بلکہ بدگمانیاں دور ہو سکتی ہیں۔

پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ انکی محبت و نفرت کا معیار صرف اسلام تھا، اور اس معاملہ میں وہ معصومیت کی حد تک مخلص تھے، ایک بار اخبار حریت میں بھولو پہلوان کی ایک بڑی سی تصویر گرز سمیت شائع ہوئی شام کو مولانا نے سب کو یہ تصویر دکھائی، بڑی خوشی کے ساتھ تصویر دکھاتے جاتے اور کہتے جاتے کہ بھولو رستم زماں ہوئے، بہرحال نام اسلام اور مسلمان کا ہوا، ایک مرتبہ خبر آئی کہ پاکستانی ہاکی ٹیم میچ جیت کر کھیل کے میدان میں ہی سجدہ شکر بجا لائی۔ بس مولانا کی طبیعت کھل اٹھی، آنکھوں میں مخصوص چمک آگئی۔ دلی کے دو نامور مسلمان خاندانوں کا ذکر کرتے، کہتے تقسیم کے بعد ان دونوں نے نام بھی خوب کمایا اور پیسہ بھی، بس ایک نے نیک نامی سے اور افسوس ہے کہ دوسرے نے بدنامی سے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن اسلام سے ان کی محبت کے لئے خدا جانے کتنی بڑی بڑی باتوں پر بھاری ہیں، مسلمانوں کی ساری بے عملی یا بدعملی کے باوجود وہ خدا کی رحمت سے کبھی ناامید نہ ہوتے، رحمت کی آس لگانے والوں میں شاید ہی کوئی ان سے بڑھ کر ہو، کسی کا انتقال جمعہ کے روز ہو، مقدس مہینوں میں ہو، اچانک ہو یا طویل علالت کے بعد ہو، پردیس میں ہو، کس پرسی کے عالم میں ہو، ہر ایک کے لئے وہ رحمت حق کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتے تھے، شاید وہ ہندوستان کے واحد ادیب تھے جن کے دینیات کے کالموں میں ایک پیراگراف اس قسم کے فال نیک کے لئے وقف رہتا اور پھر کسی کی اصلاح سے تو وہ کبھی نہ مایوس ہوتے، دریاباد کے ایک قابل فخر نوجوان، اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس گئے، پہلے وہ خاصے دیندار تھے لیکن عقل و خرد کے حملوں سے وہ خود کو فرانس کی بے روح فضا میں نہ بچا سکے، واپس آئے تو مولانا کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے رہے لیکن کبھی ایسا نہ ہوا کہ ان کے کسی قول و فعل پر مولانا نے ذرا بھی نکیر کی ہو، البتہ اکبری آئین کے مطابق ان کی اشاراتی تبلیغ جاری رہی اور آخر آخر تک ان کو اصلاح کی توقع رہی، اس سے بڑھ کر ایک بات اور یاد آگئی، دارالمصنفین کا ایک وفد اپنی مالی ضرورتوں کے لئے بمبئی گیا، مولانا بھی اس وفد میں شامل تھے، بمبئی کی ایک بہت مشہور مسلمان فلمی شخصیت نے ایک صاحب کے ذریعہ دارالمصنفین کی لائف ممبرشپ کے لئے روپے بھیجے اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ اتنی مقدس ہستیوں کے سامنے آنا میرے لئے باعث شرم و حجاب ہے اس لئے خود حاضر نہیں ہو سکتا، بس مولانا ان صاحب اور ان کے پیشہ کے سارے معائب کے باوجود ان کی اصلاح کے آرزومند و دعاگو ہو گئے، یہ دو انفرادی واقعات ہیں لیکن ان کے پیچھے اس جذبہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے، جسے ارحم الراحمین اور رحمۃ للعالمین پر اعتماد کلی تھا، جذبہ کے اسی خلوص نے انہیں "سب سے جدا اور سب میں شامل" شخصیت عطا کی تھی وہ علی گڑھ والوں کے نزدیک اتنے ہی محترم و عظیم تھے جتنا ندوہ والوں کے ہاں، احتشام حسین، آل احمد سرور اور علی سردار جعفری ان سے ویسے ہی نیازمندانہ ملتے جیسے مولانا علی میاں، شاہ معین الدین اور صباح الدین عبدالرحمٰن۔

حد تو یہ ہے کہ ان کے سامنے سمپورنا نند اور پنڈت سندر لال ایک ہی صف میں نظر آتے، یہ سارا اعجاز ان کے خلوص، صدق دلی اور دلآویزی کا تھا۔

یادوں کا یہ سلسلہ بڑا دراز ہے اور میرے لئے تو تقریباً نہ ختم ہونے والا، دریاباد، بھوپال اور لکھنؤ کے شبستانوں

(بقیہ صـ پر)

بقیہ صفحہ ۳: مکتوب امریکا

لگ بھگ دنیا کے ملکوں میں اس کا درجہ اول ہے۔

اب تو ہندوستانی، پاکستانی اور عربوں کی یہاں آمد اور سکونت بہت بڑھ چکی ہے ہر بڑے شہر میں سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں، تنہا نیویارک میں ایک لاکھ ہوں گے۔

ملک نے پرائیویٹ سیکٹر کو اپنا رکھا ہے چنانچہ مختلف صنعتیں، ہوائی کمپنیاں، ٹیلی ویژن اسٹیشن تعلیمی ادارے، ریلوے سب پرائیوٹ ہیں اور خوب ترقی پر ہیں۔

کانفرنس کے چاروں دن بلومنگٹن میں گذرے۔ بلومنگٹن اور انڈیاناپولس کے متعلق لوگوں کا یہ تاثر ہے کہ یہ صاف ستھرے اور دیگر شہروں کے مقابلہ میں زیادہ پرسکون ہیں، ہم لوگوں کا قیام ایک ہوٹل میں تھا جو کانفرنس کے مستقر سے ملا ہوا تھا۔

بلومنگٹن میں کانفرنس چار روز رہی، اس میں صبح کو درس قرآن ہوتا، دن میں اسلامی موضوعات اور اسلامی دعوت کے مساعی کے جائزے، ان پر تبصرے اور علمی موضوعات پر تقریریں ہوتیں، اجتماعات عام طور یونیورسٹی کے مرکزی آڈیٹوریم میں ہوئے یہ ایک شاندار وسیع آڈیٹوریم ہے، ماموں جی مدظلہ، کی تقریر "اسلامی دعوت کے لئے مسلمانوں کے آپسی تعلقات ایک ذریعہ" کے عنوان سے ہوئی، یہ عنوان پہلے سے دیا گیا تھا، ماموں جی مدظلہ نے اس موضوع میں جزوی ترمیم کی اجازت لے لی تھی چنانچہ انہوں نے اسلامی اخوت کے موضوع پر تقریر کی، تقریر موثر تھی اور بہت پسند کی گئی۔ اس تقریر کے علاوہ بھی کئی دوسرے موقعوں پر بھی خطاب کرنے کا موقع پیدا ہوا۔ کانفرنس کی تفصیل انشاءاللہ علیحدہ سے بیان کریں گے۔ مسلمان طلبہ کا یہ اتحاد سالانہ کانفرنس کرتا ہے اور ہر سال اس کو ایک موضوع کے ساتھ محدود کر دیتا ہے چنانچہ یہ اجتماع اس کا پندرہواں سالانہ اجتماع تھا اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ اس کا عنوان تھا۔

اجتماع سے دوشنبہ کے روز فرصت ملی اسی دن دوسرے وقت بذریعہ کار شہر انڈیاناپولس آنا ہوا وہاں تقریباً دو روز ٹھہر کر ایم۔ایس۔اے کا مرکز اور اس کے دیگر ادارے دیکھے، پھر ہوائی جہاز سے شہر بالٹی مور آئے یہ بھی خاصا بڑا امریکی شہر ہے، بندرگاہ بھی ہے اور صنعتی مرکز بھی ۲۰ لاکھ کی آبادی ہوگی، ترقی یافتہ بھی ہے اور یہاں کی یونیورسٹی اور میڈیکل ادارے شہرت کے مالک ہیں، یہاں ماموں جی مدظلہ کو اپنی آنکھ کے سلسلے میں مشورہ لینا تھا، یہاں ایک مسلمان ماہر چشم ڈاکٹر شوکت سے پہلے سے بات ہو گئی تھی، ان کے یہاں ایک روز رہکر جمعرات کی صبح کو بذریعہ ٹرین نیویارک واپسی ہوئی، ہمارے ماسٹر محمد سمیع صدیقی صاحب کے صاحبزادہ احمد مطیع صدیقی صاحب کے یہاں اترنا ہوا، ان کا اصرار بھی تھا، ریلوے اسٹیشن پر اگرچہ سید ساجد حسین صاحب بھی آئے تھے ان کے یہاں ڈاکٹر مطیع صاحب کے بعد جانا طے ہوا ہے، نیویارک میں چار پانچ روز ٹھہرنے کے بعد امریکہ و کناڈا کے مختلف علاقوں کا ایک دس روزہ پروگرام ہے، اللہ تعالیٰ مقصد بنائے اور خیر و عافیت رکھے، ہندوستان، پاکستان کی خبریں معلوم نہیں ہو رہی ہیں یہاں تو دنیا کے مشرقی ملکوں کی خبریں کم ہی ملتی ہیں، ماسٹر سمیع صاحب آجکل میں آنے والے تھے ابھی نہیں پہونچے ممکن ہے کہ آجکل میں آتے ہوں، ان سے خیریت بھی معلوم ہوگی اور ان کی آمد سے انس و دلچسپی بھی بڑھ جائے گی۔ سب جاننے والوں کو سلام کہو۔ والسلام

محمد رابع

۲/۶/۷۷ء

اعتذار

وقت کی کمی، مدیر تعمیر حیات کے سفر اور منیجر تعمیر حیات کی رخصت اس طرح کی بعض مجبوریوں کی بناء پر تعمیر حیات کا خصوصی شمارہ بسلسلہ کنونشن حلقہ پیام انسانیت شائع نہ ہو سکا۔ اس سلسلے کے مفید مضامین اور تقریریں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں گی۔

(منیجر)

بقیہ صفحہ ۶: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ......

میں ان کی محبت، شفقت اور حوصلہ افزائی کے نہ جانے کتنے چراغ روشن ہیں، کتنے عود عنبر فشاں ہیں،

یادوں کا معاملہ بھی رنگوں اور خوشبوؤں کا سا ہے نہ ہاتھوں میں آتی ہیں نہ احساس سے جُدا ہوتی ہیں۔

کہاں تک ذکر کیا جائے پھر یہ بھی تو ہے کہ "حدیث دلبراں" میں "ذکر دیگراں" نہ مناسب ہے نہ کچھ ایسا ضرور۔

ہاں آخر میں ان کی ایک وصیت یا خواہش کا بھی ذکر کر دوں، میں نے آٹوگراف بک پر اپنے لئے کسی پیغام کی خواہش کی، فرمایا، تمہیں ایسے تکلفات کی کیا ضرورت! لیکن پھر فوراً ہی یہ آیت لکھ کر زبانی بھی تلقین کی "ولا تموتن الا وانتم مسلمون" حق یہ ہے کہ ان کی یہ تمنا ہر مسلمان کیا ہر انسان کے لئے تھی وہ بڑی تلخیاں چکھنے کے بعد مسلمان ہونے کے لطف و کیف سے آشنا ہوئے تھے،

کافر نہ شدی لذت ایماں چہ شناسی

اور کسی بھی سچے بادہ خوار کی طرح سارے میخانہ میں اس مے کے بٹنے لٹنے کی تمنا کرتے تھے وہ زندگی بھر اس مے کے آرزو مند رہے پھر بھلا اس تصور کی صداقت میں کیا کلام کہ اب وہ ساقی کی بلا واسطہ توجہ سے کیسی کیسی گلابیاں چھلکا رہے ہوں گے "صدق" کی پیشانی پر والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ھم المتقون کی آیت دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے والا اسی آیت کے مابعد کی بشارت آخرت میں کس مزہ سے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوگا۔

لھم ما یشاءون عند ربھم ذلک ھو الفضل الکبیر

حامد علی تعلیمی وقف

HAMID ALI EDUCATIONAL TRUST

حامد علی تعلیمی وقف کی جانب سے،
میڈیسن، ڈنٹری، انجینرنگ، ٹکنالوجی، پالی ٹکنک
آرکیٹکچر اور زراعت کے گریجویشن کورسس میں تعلیم
حاصل کرنے والے مستحق مسلم طلباء وطالبات۔
کے نام تعلیمی سال ۷۸-۱۹۷۷ء کے لئے تعلیمی وظائف
جاری کئے جائیں گے۔

- درخواستیں ٹرسٹ کے مجوزہ فارم پر تعلیمی صداقت ناموں کیساتھ ۳۰ جولائی ۱۹۷۷ء سے قبل دستخط کنندہ ذیل کے پاس پہونچ جانی چاہیئے۔
- فارم، دفتر ٹرسٹ سے (یکشنبہ اور عام تعطیل کے سوائے) روزانہ ۳ تا ۷ بجے شام ایک روپیہ نقد یا منی آرڈر روانہ کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔
- فارم کے اجراء کی آخری تاریخ ۲۳ جولائی ۱۹۷۷ء۔

سید مظہر الحق قادری
(ٹرسٹی و جوائنٹ سکریٹری)
فون: 220437

دفتر
حامد علی تعلیمی وقف، علیگڑھ کلب
قریب نیو ایم۔ایل۔اے کوارٹرس
بشیر باغ ایریا۔ حیدرآباد 500463

چار دن علیگڑھ میں

از:۔ محمد حسن انصاری

علی گڈھ کا نام سب سے پہلے غالباً اس وقت سُنا جب اپنی ابتدائی تعلیم کے دوران درجہ چار میں سماجی علوم کے سبق میں پڑھا تھا" بنارس کی زری کی ساڑیاں، مرادآباد کے قلعی کے برتن اور علی گڈھ کے تالے مشہور ہیں "۔ پرائمری درجات کے کسی طالب علم کے لئے نہ تو تالا کوئی اہمیت رکھتا ہے اور نہ ہی زری کی ساڑیاں۔ اس کا مقصود تو ان چند جملوں کو ازبر کر کے امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔ بات آئی گئی ہوگئی مگر جب میں نے انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا اور میرے گھر والوں کو مجھے کسی یونیورسٹی میں داخل کرانے کی فکر ہوئی تو برادر معظم کی نظر انتخاب علی گڈھ یونیورسٹی پر پڑی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ مجھے علی گڈھ یونیورسٹی میں داخلہ دلایا جائے مگر کچھ تو گھر سے دوری اور کچھ مالی مشکلات کے سبب برادر معظم کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور مجھے الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ دلایا گیا جہاں میں نے چار سال تعلیم حاصل کی۔ شب و روز گذرتے رہے طالب علمی کا زمانہ ختم ہوگیا اور ملازمت کرنے لگا۔ علی گڈھ نہ جا سکا مگر کچھ لاشعوری طور سے اس کا خیال برابر بنا رہا۔ ایک چنگاری تھی کہ دبی رہی۔

جون ۱۹۶۶ء میں علی گڈھ کے پہلے سفر کی نوبت آئی ان دنوں میں گورنمنٹ انٹر کالج باندہ میں جغرافیہ کے لکچرار کے فرائض انجام دے رہا تھا اور مجھے ایک مندوب کی حیثیت سے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کی جانب سے شعبہ جغرافیہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے جغرافیہ کے سمر انسٹی ٹیوٹ میں شرکت کرنا تھا۔ اس میں شمالی ہند کے تقریباً چالیس منتخب مندوبین نے شرکت کی اور یہ ۳۵ روزہ انسٹی ٹیوٹ یکم جون ۶۶ء تا ۵ جولائی ۶۶ء رہا اس طرح ایک دیرینہ تمنا کی تکمیل کا اللہ کارساز نے سامان مہیا کیا تو ایسا کہ متواتر ۳۵ دن تک علیگڈھ یونیورسٹی کے شب و روز دیکھنے کو ملے ان دنوں ہم لوگوں کے قیام کا انتظام سرسید ہال کے عثمانیہ ہاسٹل میں کیا گیا تھا۔ اور ہمارے سارے پروگرام شعبہ جغرافیہ میں ہوتے تھے۔ راقم السطور کا یہ پہلا تعارف تھا ہندوستان کے اس دانشکدہ سے جس کی بود سرسید احمد خاں مرحوم نے جولائی ۱۸۷۵ء میں لگائی تھی اور اسے اپنے خون پسینہ سے سینچ کر محمڈن اینگلو اورئنٹل کالج کے نام سے موسوم کیا تھا اور جو ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے علم و ادب کے اس گہوارے کو قریب سے دیکھا اور سُنا جس نے اس تحتی براعظم کو مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، میر ولایت حسین، شیخ عبداللہ (بانی ویمنس کالج علیگڈھ) مولوی وحید الدین سلیم، شاہ نذیر ہاشمی غازی پوری، سجاد حیدر یلدرم، سید فضل الحسن حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولوی عزیز مرزا، مولوی عبدالحق، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا محمد اسلم جیراجپوری، علی برادران اقبال اور سہیل، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے معرکۃ الآرا اور جیالے سپوت عطا کئے اور جو سرسید کی متاع حیات ہے۔

دس سال کے بعد فروری ۱۹۷۷ء کے اوائل میں علی گڈھ کے دوسرے سفر کا موقع ہاتھ آیا۔ یہ سفر پہلے سفر کے مقابلہ میں کچھ زیادہ خوش آیند تھا۔ اللہ تعالیٰ کو احکم الحاکمین کہا گیا ہے وہ مسبب الاسباب ہے۔ اس بار مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف "السیرۃ النبویۃ" (عربی) جو قاہرہ سے شائع ہو رہی ہے اور جس کا اردو ترجمہ "نبی رحمت" کے نام سے انشاء اللہ مستقبل قریب میں شائع ہوگا، میں شامل کئے جانے والے چند نقشوں کی تیاری کی سلسلے میں مجھے مولانا موصوف نے علی گڈھ بھیجا تھا۔ یہ چار روزہ سفر راقم السطور کے لئے ایک یادگار بھی ہے اور ایک متاع حیات بھی۔ متاع حیات اس لئے کہ اس سفر کی غرض و غایت کا تعلق سید الانبیاء رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ سے تھا۔ یادگار اس لئے کہ یہ سفر عالمی شہرت کے حامل دنیائے اسلام کی اس معروف شخصیت کی ایماء پر عمل میں آیا تھا جس کے حکم کی تعمیل کرنا بڑے بڑے مؤقر حضرات اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ اس طرح سے راقم السطور کا معاملہ مصر کے بازار میں سوت کی چند پھیاں لے کر گھومتی پھرتی اس بے بساط بڑھیا جیسا رہا جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرانا ہی اپنے لئے باعث فخر و نجات سمجھا تھا۔

۸ فروری ۱۹۷۷ء کی شام کو رائے بریلی سے روانہ ہو کر ۹ فروری کی صبح علیگڈھ پہونچا۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ آفتاب طلوع ہونے میں ابھی کوئی دو گھنٹے کی دیر تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا، لہٰذا تانگہ ٹھیکہ پہونچکر رکشہ والے سے سامان مسجد کے اندر رکھوایا اور فجر تک وہیں رہا۔ آبادی کے وسط میں ہی اس مسجد کا جائے وقوع بہت مناسب اور فضا نہایت کشادہ ہے۔ یہ ترکی طرز پر بنی ہے، بعد نماز فجر ڈاکٹر ابرار مصطفےٰ صاحب سے مسجد ہی میں ملاقات ہوئی جن کے یہاں اس سفر کے دوران مجھے قیام کرنا تھا۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ بنگلہ لے گئے۔ ابرار مصطفےٰ صاحب علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں صدر شعبۂ نباتات ہیں اور ان کا شمار یونیورسٹی کے موقر اور اس سن رسیدہ لوگوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا وطن خورجہ ہے مگر اب علی گڈھ ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ دیندار، نیک اور مومن صفت انسان ہیں بطالعہ کا بہت شوق ہے۔ دلکش لان کا رکھ رکھاؤ گلاب کی مختلف قسموں کا شوق، عمدہ سبزہ زار، چمن بندی کا صاف ستھرا ذوق جو علی گڈھ کا طرۂ امتیاز ہے، اس سے ڈاکٹر صاحب مستثنیٰ نہیں۔ حد سے لگاؤ عشق تک ہے حتیٰ کہ بسا اوقات عالم (بوائے سرونٹ) کو فرشی چڑھا کر ڈائننگ ٹیبل پر ہی لانا پڑتا ہے۔ وقت کی بڑی قدر کرتے ہیں، خوش گپیوں میں (جو آجکل کے نوجوان طبقہ کی صفت خاص بن چکی ہے) وقت ضائع نہیں کرتے۔ ابرار مصطفےٰ صاحب ایک عمدہ انسان، ایک شفیق باپ اور ایک سچے استاد ہیں۔

چونکہ چہلم کی وجہ سے آج یونیورسٹی میں تعطیل تھی اس لئے اپنے ایک دوست کے ہمراہ قاسم پور جانے کا ارادہ کیا تاہم روانگی سے پہلے یونیورسٹی کیمپس سے گذرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ چہلم کے سلسلے میں وائس چانسلر جناب محمد علی خسرو کی رہائش پر مجلس کا انعقاد کیا گیا تھا۔ مجلس کی کارروائی لاؤڈ مائیکرو فون کے ذریعے باہر سڑک پر صاف سُنی جا سکتی تھی، اپنے دوست کو ساتھ لینے کی غرض سے میں یونیورسٹی کے ایک ہاسٹل میں پہونچا تو وہاں مسلم یونیورسٹی کے ایک بہت پرانے طالبعلم سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ صاحب فخریہ انداز میں بیان کر رہے تھے کہ کس طرح ان کے زمانے میں کرنل ضیاء الدین نے کرکٹ بال پر ایک ایسا زور دار چھکا لگایا تھا کہ بال جامع مسجد کی مینار کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ یونیورسٹی کے ابتدائی دور میں منٹو سرکل کا ایک نمایاں رول رہا ہے بات چیت کے دوران انہوں نے بڑے حسرت بھرے لہجے میں فرمایا کہ انھیں اپنی یونیورسٹی کی شیروانی میں نہ آسکنے کا کس قدر قلق ہے۔ اگرچہ وہ صاحب شیروانی زیب تن کئے تھے مگر ان کے لہجہ سے اس بات کا صحیح اندازہ ہوا کہ علیگڈھ کے طالب علم کو اپنا یونیفارم کس قدر عزیز ہوتا ہے۔

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا انتظام مرکزی حکومت کے زیر اہتمام ہے۔ یہ ریذیڈنشل یونیورسٹی ہے۔ یہاں کے ہوسٹل لائف کی ایک نمایاں اور امتیازی خصوصیت یہ رہی ہے کہ سینئر اپنے سے جونیئر کا اس سے کہیں زیادہ خیال رکھتا ہے جتنا کہ کوئی بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کے لئے کر سکتا ہے اور جونیئر

اپنے سینئر کا بے حد ادب و لحاظ کرتا ہے یہ برادرانہ شفقت یہاں کی ایک گرانقدر روایت رہی ہے مگر اس سفر کے دوران مجھے اس کا کچھ نقدان نظر آیا جو اس مشہور ادارہ کے مستقبل کے لئے یقیناً اچھی علامت نہیں ہے۔

قاسم پور ہم لوگ ۹ فروری کو بعد نماز ظہر پہونچے۔ یہ مقام علی گڈھ سے قریب ۲۰ کلو میٹر دور ہے اور بذریعہ بس ۴۵ منٹ کا راستہ ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا تھرمل پاور اسٹیشن ہے جس کا شمار ایشیا کے بڑے پاور اسٹیشنوں میں کیا جاتا ہے اس کے اے۔ بی اور سی۔ تین اسٹیج ہیں۔ اس وقت تیسرے اسٹیج کا کام چل رہا ہے۔ یہاں سے یوپی کے مغربی اضلاع کو بجلی فراہم کی جاتی ہے اس پاور اسٹیشن کی وسعت کا اندازہ اس بات سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہاں کی دس ہزار سے زیادہ کی آبادی بالواسطہ یا بلاواسطہ تھرمل پاور ہی سے متعلق ہے۔ میلوں رقبہ میں پھیلی اس آبادی میں متعدد ایگزیکیٹو انجینئرز اور سپرنٹنڈنگ انجینئرس کی رہائش گاہیں ہیں جو یہاں پر تعینات ہیں یہ ایک بڑی بستی کے مانند ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب عصر کی نماز ادا کرنے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ اس بڑی بستی میں ابھی تک کوئی مسجد نہ تھی اب اللہ کے کچھ نیک بندوں نے اس کام کو شروع کیا ہے، اور خوش آئند بات یہ ہے کہ اس مسجد کی تعمیر میں یہاں کے مسلمانوں سے زیادہ یہاں کے ہندو حضرات نے گرمجوشی کا ثبوت دیا ہے جو ہمارے ملک کی ملی جلی تہذیب کے لئے فخر کی بات ہے۔

۱۰ فروری کو ۹½ بجے صبح شعبہ جغرافیہ گئے جہاں مجھے یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر اور صدر شعبہ جغرافیہ پروفیسر محمد شفیع سے ملنا تھا۔ جغرافیہ کے میدان میں عالمی شہرت کی حامل اس شخصیت سے اگرچہ وہ ملاقات مختصر ہی مگر نہایت مفید اور خوشگوار۔ پروفیسر محمد شفیع ایک نہایت محنت کش، ذہین، متین اور سنجیدہ انسان ہیں ان کی قیادت میں مسلم یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ نے جو نام کمایا ہے وہ کسی کے لئے محتاج تعارف نہیں۔

بعد دوپہر کینڈی آڈیٹوریم جو کینیڈی ہال کے نام سے مشہور و معروف ہے، دیکھنے گئے۔ اس آڈیٹوریم کی سن تعمیر ۱۹۶۶ء ہے، اس کی تعمیر سے متعلق اخراجات امریکہ کی فورڈ فاؤنڈیشن نے برداشت کئے ہیں۔ ۱۳۲۰ نشستوں والا یہ آڈیٹوریم ساؤنڈ پروف اور فائر پروف بنا ہے، اس میں کوئی ستون نہیں ہے اور جس لوہے کے اسٹرکچر پر اس کی چھت روکی گئی ہے وہ گرڈر ہے۔ آڈیٹوریم میں ماضی قریب میں منعقد سیمینار جس کا موضوع "اسلام تغیر پذیر دنیا میں" تھا کے افتتاحی خطبہ اور اختتامی ہدایات کی صدائے بازگشت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یاد تازہ کئے دے رہی تھی، کینڈی آڈیٹوریم ہر اعتبار سے ایک جدید ترین آڈیٹوریم ہے جب کہ یہاں کے اسٹریچی ہال میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ پرانے طرز کا ایک وسیع ہال ہے۔ وہ متعدد روساء کے عطیات کا ثمرہ ہے۔ جب کہ یہ ایک ادارہ کی دریا دلی کی آئینہ دار ہے اگرچہ دونوں کی عمر میں قریب نصف صدی کا فرق ہے مگر دونوں کے نام سے مغربیت کی بو آتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان واقع ہے مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری کا۔ یہ لائبریری ایک جدید نو منزلہ عمارت میں واقع ہے اس میں تین لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں، ان کے علاوہ بہت سے نوادر اور قلمی نسخے اس کتب خانہ کی زینت ہیں۔

اس کے ایک سیکشن میں کانگریس لائبریری نیو یارک کی کتابوں کے کیٹلاگ کا مکمل سیٹ دیکھنے کو ملا۔ جو خود ایک چھوٹی موٹی لائبریری سے کم نہیں۔ لائبریری کا ٹیکسچول سیکشن (TEXTUAL SECTION) اپنی مثال آپ ہے اس میں بیک وقت ۵۰۰ طلبہ آرام کے ساتھ بیٹھ کر مطالعہ کر سکتے ہیں، یہ سیکشن ان طلبہ کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا ہے جو مالی مشکلات کے سبب نصاب کی کتابیں نہیں خرید سکتے ہیں۔

یونیورسٹی کیمپس میں یہاں کے مختلف شعبہ جات کچھ اس طرح بکھرے ہیں جیسے آسمان پر تارے، جن میں کوئی ترتیب نہ ہونے پر بھی ایک دلکشی اور کشش ہوتی ہے۔ کیمپس میں جگہ جگہ ایک پوسٹر دیواروں پر چسپاں دیکھا جس پر جلی حرفوں سے لکھا تھا "کیا یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو ہونا چاہیے؟" یہ تو نہ معلوم ہو سکا کہ اس بڑے سوالیہ نشان کے حق میں رائے عامہ کیا رہی مگر یہ ضرور ہوا کہ ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء کو علی گڈھ کے رجل رشید" اردو ادب اور سرسید کو سوگوار چھوڑ کر پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

شام کو بعد مغرب تار بنگلہ والی مسجد میں مرحوم رشید احمد صدیقی کے برادر خورد جناب نیاز احمد صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ نیاز صاحب میں انکساری اور سبک مزاجی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ ان دنوں رشید احمد کے انتقال کر جانے کی وجہ سے علی گڈھ میں ہی قیام پذیر تھے۔

علی گڈھ میں راقم السطور کا قیام ڈاکٹر ابرار مصطفےٰ صاحب کی رہائش گاہ پر تھا جہاں میرے کمرے میں ساری سہولتوں کے ساتھ مطالعہ کا بھی معقول انتظام تھا۔ یہاں میں نے "اسلام تغیر پذیر دنیا میں" کے موضوع پر ہوئے سیمینار میں پیش کئے گئے متعدد مقالے پڑھے ان میں ایک مقالہ "سنوسیہ تحریک" پر تھا جو بہت پسند آیا۔ افسوس ہے کہ اس مقالے کے لکھنے والے کا نام یاد نہیں رہا، یہیں میں نے "AN INTRODUCTION TO SAUDI ARABIA" BY DOTA AL-SYED IBRAHIM BIN OMAR AL SAGOFF. کا مطالعہ کیا ۱۹۶۷ء میں سنگاپور سے مطبوعہ ۱۶۰ صفحات کی یہ کتاب نہایت دیدہ زیب ہے در سعودی عرب کے متعلق بڑی عمدہ معلومات فراہم کرتی ہے۔ اگرچہ میں عربی نہیں جانتا پھر بھی نقشوں کی تیاری کے سلسلے میں، میں نے کچھ حد تک علی حافظ کی عربی تصنیف "فصول من تاریخ المدینۃ المنورۃ" سے فائدہ حاصل کیا۔ یہ کتاب ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور جدہ سے شائع ہوئی ہے۔

۱۱ فروری ۱۹۷۷ء کو قریب ۹ بجے صبح یہ روح فرسا خبر ملی کہ صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ یونیورسٹی بند کردی گئی ہر جگہ مرحوم کی شریف النفسی کے تذکرے تھے اور ہر مجلس میں ان کے اچانک انتقال کر جانے پر رنج و غم کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ بعد جمعہ وائس چانسلر جناب محمد علی خسرو صاحب اور پرو وائس چانسلر جناب محمد شفیع صاحب دہلی کے لئے روانہ ہوگئے۔ نماز جمعہ یونیورسٹی کی جامع مسجد میں ادا کی۔ یہاں کی جامع مسجد کی وسعت، نقش و نگار خاص کر آیات قرآنی سے محراب اور در و دیوار کی تزئین و نیز صفائی کے اعتبار سے اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے اور وہ منظر بڑا ہی

روح پرور ہوتا ہے جب نماز جمعہ کے لئے ہر طرف سے لوگ جوق در جوق یہاں کے خاص لباس شیروانی ملبوس اس طرح سے نظر آتے ہیں جیسے کسی بڑے دریا کی طرف بارش کے بعد رواں دواں ندی نالے ہوں۔ اس بار میں یونیورسٹی کیمپس میں پہلے سے کچھ دیندار لوگ دیکھنے میں آئے مسجدیں بھی نسبتاً زیادہ آباد نظر آئیں، کہہ نہیں سکتا کہ یہ تبدیلی ملک میں ہنگامی حالات کے نفاذ اور نس بندی کی مہم (جو اب ختم ہو چکی ہے) کی دین تھی یا کہ اللہ کے ان نیک بندوں کی کوششوں کا نتیجہ جو دنیا کے گوشہ گوشہ میں جا کر اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کی تبلیغ میں مصروف کار ہیں۔ ایک خوشگوار اضافہ یہ دیکھنے میں آیا کہ جامع مسجد کے سامنے اسی کے حدود سے ملحق ایک کمرے میں قرأت کا ایک کمرہ مقرر کیا گیا ہے جہاں طلبہ کو قرأت کی مشق کرائی جاتی ہے۔

بعد نماز جمعہ ابرار صاحب کے مکان پر ایک دلچسپ شخصیت سے ملاقات ہوئی یہ صاحب خالص علیگڈھی ہیں نام غالباً سعید خاں ہے عمر ستر سے تجاوز کر چکی ہوگی۔ تعارف کے دوران جب انھیں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے تعلق کا علم ہوا تو فرمانے لگے۔ مولانا جمعہ کو سورہ "الکہف" پڑھنے کی بڑی تاکید فرماتے ہیں اور ان کے یہاں برابر اس پر عمل ہوتا آیا ہے اگر وقت کم ہو تو اس کی دس آیتیں پڑھ لے اور یہ کہہ کر خانصاحب نے قرأت شروع کردی، دوران قرأت ایک صاحب نے مداخلت کی تو ان پر برس پڑے اور انگریزی میں فرمایا "خاموش! میں قرآن پڑھ رہا ہوں اور تم بدتمیزی کرتے ہو" سعید خانصاحب چند منٹ ہی ٹھہرے اور سیلانی کی طرح چلتا ہوئے مگر ہمارے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑ گئے۔

۱۲ فروری کی صبح ابرار مصطفےٰ صاحب کی رہائش گاہ پر کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب احسان رشید صاحب ابن رشید احمد صدیقی مرحوم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ احسان صاحب اپنے والد صاحب کے انتقال کی خبر پاکر ہندوستان آئے ہوئے تھے افسوس ہے کہ تنگی وقت کے سبب احسان صاحب کی صحبت سے راقم السطور زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔ احسان صاحب ایک ذہین، متین اور سنجیدہ شخصیت کے حامل ہیں۔

۱۲ فروری کو دوپہر میں مسلم یونیورسٹی کے ہرے بھرے پُرسکون اور صاف ستھرے کیمپس کو الوداع کہہ کر اسٹیشن پہونچا اور اسی ریل سے واپسی کا سفر شروع ہوا۔ اللہ کا شکر و احسان ہے

ندوہ کا ایک چراغ

مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

* ایک عظیم مصنف
* ایک نامور صحافی
* ایک جلیل القدر عالم

* سادگی کا پیکر
* خلوص کا مجسمہ
* تنہائی کا خوگر

اب کہاں ہیں ایسی شخصیتیں اور ایسے شفاف قلوب
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

* طلحہ بن ابو سلمہ ندوی (ایم۔ایم مدرسہ عالیہ کلکتہ)

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنے دورِ عروج میں جو بڑے بڑے انشاء پرداز اور نامور علماء پیدا کئے ان میں ایک مولانا عبد السلام ندوی بھی ہیں ان کی ولادت سنہ ۱۳۰۰ھ میں بمقام اعظم گڈھ ہوئی۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم محلے کے مکتب میں ہوئی، نیز فارسی کی تکمیل اپنے خسر مولوی عبد اللہ صاحب سے کی بعد میں عربی تعلیم کے لئے کانپور اور آگرہ کا بھی سفر کیا پھر سنہ ۱۹۰۶ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور سنہ ۱۹۱۰ء میں یہاں سے فراغت حاصل کر لی۔

مولانا ادب و انشاء میں ممتاز تھے چمنستان ادب میں ان کا قلم بڑا ہی سبک خرام تھا مولانا کا قلم اتنا منجھا ہوا تھا کہ لکھنے کے بعد مسودہ پر نظر ثانی یا اصلاح کی ضرورت نہ ہوتی تھی مولانا کا قلم کسی خاص موضوع تک محدود نہ تھا بلکہ ہر موضوع پر ہر وقت لکھنے کو تیار رہتے تھے، قلم کو جس طرح موڑ دیتے۔ مثلاً آپ نے اخلاق، فلسفۂ کلام، عقلیات، عمرانیات، الٰہیات، نفسیات، تفسیر و حدیث، منطق، تاریخ، سیر، معانی، بیان، بدیع، عروض، تنقید، خطابت، شاعری وغیرہ پر خوب لکھا اور ان سب موضوعات میں کامیاب اور ممتاز رہے۔

مولانا نے سب سے پہلے مضمون ندوہ کے دورِ طالب علمی ہی میں "تناسخ" جیسے اہم موضوع پر لکھا جس نے علماء و ادبی دنیا میں ایک دھوم مچا دی اور اکثر اہل علم متعجب ہوئے علامہ شبلیؒ کو یہ مضمون اس قدر پسند آیا کہ اس کو بغیر اصلاح کے "الندوہ" میں چھاپ دیا اور پانچ روپیہ انعام بھی دیا۔

اس مضمون سے مولانا عبد السلام کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز ہوا اور اس کے بعد برابر مضامین لکھتے رہے، یعنی کبھی تو ترجمہ کر کے اور کبھی طبعزاد مضمون لکھ کر کسی نہ کسی رسالے کو ضرور دیتے رہے جب مولانا کی علمیت و ادبیت ترقی کر گئی اور ان کا قلم پختہ ہو گیا تو زمانہ طالب علمی ہی میں مولانا شبلی نے ان کو الندوہ کا اسسٹنٹ اڈیٹر پھر اڈیٹر بنا دیا۔

اس کے بعد جب مولانا شبلی نے "سیرۃ النبیؐ" کے لکھنے کا کام شروع کیا تو مولانا عبد السلام ندوی کو لٹریری اسسٹنٹ بنا دیا گیا اس وقت الندوہ جیسے بلند اور اونچے پرچہ میں مضمون نکل جانا ہی بڑی بات تھی چہ جائیکہ اس کا اڈیٹر پھر سیرۃ النبیؐ کی تالیف میں شرکت سبحان اللہ۔

اس زمانے میں مولانا ابو الکلام آزاد بھی الندوہ کے مدیر رہ چکے تھے۔ انہوں نے مولانا عبد السلام کی علمی و ادبی ذہانت کا پورا پورا اندازہ کر لیا تھا، اس لئے جب مولانا ابو الکلام آزاد نے کلکتہ سے الہلال نکالنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے جہاں ملک کے دیگر نامور ادباء کو اس میں کام کرنے کی دعوت دی، وہیں مولانا عبد السلام ندوی کو بھی بلا لیا اور مولانا ڈیڑھ دو سال تک الہلال میں کام کرتے رہے۔ لیکن اس درمیان حالات نے ایسا پلٹا کھایا یعنی جو الہلال کلکتہ کی افق سے آن بان اور شان سے نکل رہا تھا اور ہزاروں لاکھوں کے دلوں کو منور کر رہا تھا اچانک سنہ ۱۹۱۴ء میں الہلال کو برٹش گورنمنٹ نے بند کر دیا اور اسی سال ۱۸ نومبر کو مولانا شبلیؒ بھی دار فانی سے آخرت کی طرف سدھار گئے اور ناچار مولانا عبد السلام کلکتہ واپس آگئے اور واپس جا کر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ساتھ دار المصنفین میں کام کرنے لگے اور مولانا شبلی کے پیش نظر جو علمی کام تھے اور جن کو وہ اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکے تھے مولانا شبلی کے ان ہی دونوں لائق وفائق شاگردوں (مولانا سید سلیمان ندوی و مولانا عبد السلام ندوی) نے ان کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا اور اس وقت سے وفات تک دار المصنفین سے وابستہ رہے یہاں تک کہ مرکر ہی اس سے جدا ہوئے۔

مولانا ایک طرف ادیب، مؤرخ، شاعر و نقاد اور جید عالم تھے تو دوسری طرف سادگی کے پیکر اخلاق حسنہ کے ہمدردی و بھائی چارگی کا مجسمہ تھے ابتدائی تعلیم میں مولانا نے فارسی پر بھی پوری طرح کمال حاصل کر لیا تھا اور برابر اپنے بہنوئی کے ساتھ آگرہ جایا کرتے تھے اور اکثر ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرتے اور کبھی غزل کہہ کر لے جاتے تھے اس لئے ابتدائی مشق سخن میں اس زمانے کے ذوق کے مطابق اچھے شعر کہنے لگے جس کی داد اس دور کے اساتذہ نے دی، مثلاً ؎

میں مرگیا ہوں کیس غرض چمن کے لئے
کہ لائیں چادر گل بلبلیں کفن کے لئے
بدگمانی سے انہیں میری نظر وہ سمجھے
جھکے ذرے بھی اگر روزنِ دیوار کے پاس

آگرہ کے بعد مولانا اردو شاعری کے اصل مرکز لکھنؤ پہونچ گئے یہاں کے در و دیوار سے شاعری برستی تھی پرانے اساتذہ کی متعدد یادگاریں باقی تھیں، لکھنؤ کی فضا امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنوی کی زمزمہ سنجیوں سے گونج رہی تھی۔ خود مولانا شبلی کی صحبت میں شعر و ادب کا چرچا رہتا تھا۔ اس ماحول نے مولانا کو پورا شاعر بنا دیا۔

فن شاعری پر مولانا کی نظر بڑی گہری اور استادانہ تھی جس کا ثبوت ان کی کتاب شعر الہند ہے قدیم طرز کے دلدادہ بھی اس کے پابند تھے دورِ جدید کی بعض جدتوں بلکہ بدعتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اس کو شاعری نہیں سمجھتے تھے فن کے قواعد کی پابندی اور زبان کی صحت و صفائی کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ان کو لکھنؤ کا اصلاح شدہ رنگ بہت پسند تھا اس لئے میر ضامن علی جلال کو آخری دور کا سب سے [illegible] شاعر مانتے تھے اور خود بھی اسی رنگ میں کہتے تھے مگر کبھی کبھی داغ و امیر کے رنگ کے شوخ اشعار بھی قلم سے نکل جاتے تھے۔

مولانا اتنے مضامین لکھے ہیں کہ انہیں یکجا کر دیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں جو ان کی مستقل تصانیف ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) اسوۂ صحابہ (دو جلدیں)

پہلی جلد میں عقائد۔ عبادات، معاملات اور اخلاق و معاشرت وغیرہ کے متعلق صحابہ کرام کے موثر واقعات، دوسری جلدیں انکے مذہبی سیاسی اور علمی کارناموں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے جس سے زندگی کے ہر شعبہ میں علمی کارناموں کا ذکر اس طرح کیا گیا جس سے زندگی کے ہر شعبہ میں تعلیمات کا عملی مرقع سامنے آجاتا ہے۔

(۲) اسوۂ صحابیات

ازواج مطہرات۔ بنات طاہرات اور عام صحابیات کے اخلاق و معاشرت کے متعلق موثر واقعات کا مجموعہ۔

(۳) سیرۃ عمر بن عبد العزیز

جب عنان حکومت حضرت عمر بن عبد العزیز کے ہاتھوں میں آئی تو انہوں نے ہر طرح کے خطرات برداشت کر کے اس حکومت کو خلافت کے قالب میں بدل کر پھر ایک بار صدیقی اور فاروقی عہد کی یاد تازہ کر دی، انہیں حقائق تفصیل تاریخ کے اوراق پارینہ سے تلاش کر کے اس کتاب میں یکجا کئے گئے ہیں۔

(۴) مولانا شبلی کی تاریخ کے طرز پر اسلامی تاریخ لکھنا چاہتے تھے لیکن یہ عزم مکمل نہ ہو سکا اور کتاب کی صرف ایک جلد مکمل ہو سکی۔

(۵) امام رازی

اس کتاب کے اندر امام رازی کے مفصل حالات اور ان کی تصانیف پر تبصرہ ان کے فلسفۂ علم الکلام اور نظریات و خیالات بیان کئے گئے ہیں اور ان پر نقد و تبصرہ بھی ہے۔

(۶) حکمائے اسلام (دو جلدیں)

فلسفہ کی تمام شاخوں طبعیات، الٰہیات، منطق اور ریاضی وغیرہ ہیں، مسلمان حکماء اور فلاسفہ کے بڑے بڑے کارنامے ذکر کئے گئے ہیں۔

(۷) شعر الہند:

پہلی جلد میں اردو شاعری کی ابتدا سے لے کر، فانی، حسرت، اصغر، شاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی، اکبر الہ آبادی، اقبال، جوش ملیح آبادی یعنی دورِ جدید کے شعراء تک کا ذکر ہے، دوسری جلد میں اصناف شاعری یعنی غزل، ریختی، درسوخت قصیدہ، مرثیہ۔ مثنوی۔ ڈرامہ اور مذہبی صوفیانہ اخلاقی شاعری پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۸) اقبال کامل:

اس کتاب میں اقبال کی شاعری کی تاریخی سرگذشت اور اس کے مختلف ادوار قائم کر کے ہر دور کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

(۹) فقہ اسلامی:

یہ کتاب خضری کی کتاب "التشریع الاسلامی" کا ترجمہ ہے جس کے اندر فقہ اسلامی کی مفصل تاریخ ہے اور ہر دور کے فقہ و فقہاء کے حالات وغیرہ کی تفصیل ہے۔

(۱۰) ابن خلدون:

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب جو اصل فرنچ میں تھی اور اس کا عربی ترجمہ ہوا تھا اس کتاب کا یہ اردو ترجمہ ہے۔

(۱۱) انقلاب رقم:

یہ کتاب مشہور فرانسیسی عالم و مفکر گستاؤلی کی کتاب کے عربی ترجمہ کا اردو ترجمہ ہے۔

۱۲ القضاء فی الاسلام:

اس کتاب میں شہادت اور فصل مقدمات کے اسلامی قوانین و اصول تحریر کئے گئے ہیں اور ان کی تشریح کی گئی ہے۔

۱۳ فقرائے اسلام اور ابن یمین

یہ دونوں کتابیں تلخیص ہیں۔

ان کے علاوہ جن کتابوں میں علامہ سید سلیمان ندوی کا ہاتھ بٹایا وہ یہ ہیں:

(۱) سیرۃ النبیؐ منصب نبوت (۲) سیرۃ النبیؐ تیسری جلد معجزات (۳) سیرۃ النبیؐ جلد اخلاق۔ (۴) حیات شبلی۔

ان مذکورہ تصانیف کے علاوہ مختلف موضوعوں پر سینکڑوں مضامین لکھے اور ہر علوم و فنون میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا جو معارف اور دیگر رسائل کے ہزاروں صفحات میں موجود ہیں۔

مولانا نام و نمود جاہ طلبی اور کبر و غرور سے کوسوں دور تھے، وہ ہلڑبازی، ہجوم کثرت اور اژدہام سے بہت پرہیز کرتے تھے۔ گوشہ نشینی اور تنہائی انہیں زیادہ پسند تھی اس لئے ان کی دنیا قلم تک ہی میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ نہ کہیں جانا نہ آنا۔ نہ تقریر نہ وعظ نہ کسی علمی مجلس میں مقالہ پڑھنا نہ شعر سنانا، بس تنہائی کی راتیں ہوتیں اور تنہائی کے دن، تنہائی کی صبح ہوتی اور تنہائی کی شام بھی ان کے لئے باعث فخر ہوتا اور یہی ان کے ذوق کے لئے موزوں۔

جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا کہ مولانا سادگی کے پیکر تھے۔ مولانا کی سادگی کا یہ حال تھا کہ ایک بار کسی مجلس میں تقریر کر رہے تھے سامنے مائک لگا ہوا تھا لیکن زیادہ فاصلہ پر تھا جس کی وجہ سے آواز دور تک نہیں پہونچ پا رہی تھی۔ ایک شخص اٹھا اور مائک کو مولانا کے قریب کر دیا۔ مولانا پیچھے ہٹ گئے کہ تھوڑی دیر کے بعد پھر اس شخص نے مائک کو قریب کر دیا۔ مولانا پھر پیچھے ہٹ گئے اور اسی طرح تقریر ختم کی۔

تقریر کے اختتام کے بعد کچھ احباب آئے اور کہا کہ مولانا آپ مائک دور کیوں رہتے تھے دور کے لوگوں نے آپ کی تقریر بالکل نہ سنی مولانا نے کہا کہ بھائی ہم پیچھے اس بنا پر ہو جاتے تھے کہ بجلی ہمیں پکڑنے نہ پائے۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ بجلی میں کرنٹ ہوتا ہے جو آدمی کو پکڑ لیتا ہے۔

اتنی بڑی عظیم شخصیت علمی دنیا کا ایک اتنا بڑا حکمراں، قلم کا اتنا بڑا دھنی اور اس کی معصومیت کا یہ حال اللہ اللہ ایسی ایسی مثالیں بے نفسی اور سادگی کی نادر ہی نہیں نایاب ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ماضی قریب کے مصنفین میں کوئی ایسا گذرا ہے جس کے زبان، قلم اور ہاتھ سے کسی دوسرے کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہونچی ہو اور "المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ" کا پورا پورا مصداق ہو تو بلاشبہ مولانا عبد السلام ندوی ہی کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔

اب کہاں ایسی شخصیتیں اور کہاں ایسے شیشہ کی طرح صاف قلوب؟

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

پرنٹر، پبلشر، مسئول سید محمد حسنی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی سے طبع کرا کر دفتر "تعمیر حیات" ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔
اڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی
کتابت: جلال الدین بستوی ندوی

عنبر بہرائچی

انوپم جوت

ودائع شام غم، صبح مسرت کا زمانہ ہے
خدا کا فضل ہے، عید ولادت کا زمانہ ہے

انوپم جوت کے پونم، ضیائے مہرتابانی
منوہر روپ کے سنگم، مجسم حسن ایمانی
مدھر سندیس کے سرگم، پیام لطفِ سبحانی
سرور قلب وحدت جانِ رحمت کا زمانہ ہے
خدا کا فضل ہے، عید ولادت کا زمانہ ہے

کنول کی چھاؤں میں کانٹے سہانے کامنی بن کر
اندھیرے، نور کے ساون میں جھکے چاندنی بن کر
گھٹی آہیں لہک اٹھیں سہانی راگنی بن کر
نگیں ہیں سنگ ریزے بھی بعثت کا زمانہ ہے
خدا کا فضل ہے عید ولادت کا زمانہ ہے

مگھر من موہنی چھب، منبع تنویر و زیبائی
مدھر امرت بھری بانی، سرود عقل و دانائی
سلونی پربت کے مدھوبن، چمن زار مسیحائی
ضمیر راز خلوت، شان جلوت کا زمانہ ہے
خدا کا فضل ہے عید ولادت کا زمانہ ہے

نچھاور بائے انور پر روپہلی صبح کا آنچل
رُخ پرنور سے ہے بارش انوار کی جل تھل
زسرتا پا بہار گلستانِ فکرِ عز وجل
بنائے خلقت عالم کی بعثت کا زمانہ ہے
خدا کا فضل ہے عید ولادت کا زمانہ ہے

یوسف انور

غزل

(ایمر جنسی کی قہر مانیوں سے متاثر ہو کر)

گل و لالہ ہر ایک سرو و سمن پُر دار ہے ساقی
حسینانِ چمن کی زندگی دشوار ہے ساقی

تمہاری راہ کی لذت سے جو واقف ہے دنیا میں
وہ زیر دام کیا آتا وہ زیر دار ہے ساقی

ہوس کی ضربتیں توبہ! مگر کچھ ہو نہیں سکتا
ضمیر عشق تیری یاد سے بیدار ہے ساقی

معاذ اللہ! تمہاری راہ سے میں اب پلٹ جاؤں
کہ جب ہر اک نگاہِ وقت شعلہ بار ہے ساقی

تمہارے واسطے جینا، تمہارے واسطے مرنا
اگر یہ جرم ہے تو جرم کا اقرار ہے ساقی

ستمگر کو ستمگر کہہ دیا ہے کیا قیامت ہے
جبینِ وقت کی ہر اک شکن تلوار ہے ساقی

نگاہ جذب و مستی میں اسی کی قدر ہوتی ہے
جو کوئے یار کی خاطر فراز دار ہے ساقی

وہی انور جسے شیخ حرم کہتا ہے دیوانہ
بوقت امتحاں دل شکن خود دار ہے ساقی